ANDLEEB

نرسز ایسوسی ایشن کا اجلاس

کیا اردو میں بھی نرس کیلئے نصاب تعلیم ہے؟

بمبئی کے آل انڈیا برٹش نرسز ایسوسی ایشن کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۲۵ نومبر ۱۹۴۱ء کو لیڈی لمبلی صاحبہ نے بڑے پر زور الفاظ میں ہندوستانی عورتوں سے اس بات کی درخواست کی کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں نرسنگ کا کام سیکھیں تاکہ مریضوں کی تیمارداری کے فرائض زیادہ صحیح طور پر انجام دیئے جا سکیں۔ صدر جلسہ مس اے ڈلکنسن نے دوران تقریر میں فرمایا کہ علاوہ بمبئی کے ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے صرف ۶ صوبوں کے ۲۷۲ مریضوں اور امراض کیلئے ایک ہی نرس مہیا کی جا سکتی ہے اور اس کے برعکس بمبئی شہر میں اس قدر کثیر تعداد میں نرسیں ہیں کہ انھیں اپنی زندگی کی ضروریات اس کام سے پورا کرنا ایک مشکل امر ہو گیا ہے۔ لیکن کانفرنس میں نہ تو یہ بتلایا گیا کہ بمبئی میں کرسچین، پارسی، ہندو اور مسلمان نرسوں کی تعداد کیا ہے۔ کتنی لڑکیوں یا عورتوں کو نرس بنانے میں مدد پہنچائی گئیں اور نہ یہی بتلایا گیا کہ آیا گورنمنٹ نے اب تک کوئی ایسی تجویز بھی پیش کی کہ جس سے مسلمان لڑکیوں اور عورتوں کو اس کام کے لئے آمادہ کیا جا سکے۔ نہ ہمیں یہ معلوم ہو سکا کہ نرسنگ کا کام سیکھنے والی مسلمان عورتوں کی تعداد کیا ہے؟

موجودہ زمانہ میں ایک نرس کا وجود کس قدر ضروری ہے یہ کوئی ایسا پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے کہ جس پر تفصیل سے روشنی ڈالنے کی ضرورت ہو۔ ہر شخص جانتا ہے کہ عورت کا نرم و نازک ہاتھ مریض کی شفایابی میں کس قدر معاون ثابت ہوا ہے جس خوشی اور مسرت سے وہ ایک چڑچڑے مریض کی تنک مزاجیوں کا ہلکے تبسم سے جواب دیتی ہے وہ اسی کا حصہ ہے اور جس طرح وہ بعض وقت اپنی ساری رات مریض کی آہ و کراہ میں اس کے سرہانے بیٹھ کر گذار دیتی ہے وہ صبر کے اور تحمل کی ایک بین مثال ہے۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا تعلق محض ہسپتال ہی تک نہیں ہے بلکہ اس کو عوام کے گھروں میں ان کی عورتوں کے ایام زچگی کی اہم ضروریات کی دیکھ بھال بھی کرنی پڑتی ہے۔ تو ہمیں مسلمان گھرانوں میں اس کی قلت دیکھکر بیحد مایوسی ہوتی ہے۔ اور مسلمان عورتوں کی کس مپرسی معلوم کرکے بیحد افسوس ہوتا ہے کہ دیکھا گیا ہے کہ لیک جاہل دائی جس کو نہ تو جدید آلات سائنس کی کچھ خبر ہے اور نہ وہ اطمینان بخش سائنٹفک طریق علاج ہی سے واقف ہے۔ مختلف خاندانوں سے اپنا تعلق رکھتی ہے۔ اور جب بوقت ضرورت وہ کسی ایک جگہ طلب کی جاتی ہے تو وہ اپنے پرانے فرسودہ طریقوں پر اطمینان کے ساتھ جو جی میں آتا ہو کرتی رہتی ہے۔ اب اگر آپ کو ان کے اس غیر مطمئن بخش طریق کار کا نتیجہ معلوم کرنا ہے۔ تو آپ مسلم بچوں کی شرح پیدائش سے ان کی اموات کا موازنہ کرکے دیکھ لیجئے۔ آپ کو خود معلوم ہو جائے گا۔ کہ اس مرگ ناگہاں کا اوسط کیا ہے؟ اور اس کے اسباب کیا ہیں؟

ہمیں یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ ایک کرسچین خاندان بوقت ضرورت ایک کرسچین نرس ہی کو طلب کرتا ہے اسی طرح ایک پارسی یا ہندو خاندان کے افراد ایک پارسی یا ہندو قوم سے منسلک نرس ہی کو پسند کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کا خیال ہے کہ وہ نرس کہ جو ان کی ہم مذہب ہے زیادہ خلوص و ہمدردی سے ان کی مددگار ثابت ہوگی اگرچہ ہمارا ذاتی عقیدہ یہی ہے کہ ایک نرس خواہ وہ کسی قوم یا مذہب سے تعلق رکھتی ہو۔ ہر قسم کے تعصبات سے بالاتر ہے اور اس کی ہمدردیاں اور دلسوزیاں ہر طبقہ سے یکساں طور پر وابستہ ہیں لیکن ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مسلم طبقہ عوام کی عورتیں بوقت ضرورت جب کسی دائی پر نرس کو ترجیح دیتی ہیں تو دیگر اقوام کی طرح وہ بھی یہی چاہتی ہیں کہ نرس ان کی ہم مذہب ہو تاکہ زیادہ سے زیادہ اس سے ہمدردی و مہربانی کی توقع کی جا سکے۔ لیکن جب اپنی کوشش میں وہ ناکام رہتی ہیں تو پھر ان کی تکالیف و بیچارگی کی داستان زیادہ دردناک ہو جاتی ہے۔

غالباً سنہ ۱۹۳۸ء یا سنہ ۱۹۳۹ء کا واقعہ ہے کہ جب پہلی بار سر علی محمد خان صاحب کی وزارت کے ایام میں گورنمنٹ نے ہسپتالوں میں نرسوں کی اردو میں تعلیم دلانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا اور پھر سنہ ۱۹۳۹ء میں مسٹر این۔ وائی۔ نوری صاحب نے سر علی محمد صاحب سے کہا کہ اگر مسلمان عورتوں کی درخواستوں کی ایک مقررہ تعداد موصول ہوئی۔ تو اردو میں نرسنگ کی تعلیم دینے کی اسکیم عمل ہو جائے گی۔ ہمیں یہ تو معلوم نہیں کہ کتنی درخواستیں آئیں لیکن اس کا ضرور علم ہے کہ تین لڑکیوں کی درخواستیں منظور کر لی گئیں اور ان کی تعلیم کے متعلق "کاما" اور "آلبیلس" ہسپتال کے اراکین نے اپنے اسپتالوں میں اردو میں نرسنگ کی تعلیم حاصل کرنے کی اس شرط کے ساتھ اجازت بھی دیدی کہ گورنمنٹ کی وزارت اس کا ذمہ لے کہ اردو زبان کی کتابیں مہیا کی جائیں گی اور اردو کے لکچرار مقرر کئے جائیں گے۔ لیکن مسٹر نوری نے اس کام سے کس قدر دلچسپی لی۔ یہ امر بھی پوشیدہ نہیں رہا۔ انھیں تو کبھی اس کا خیال آیا کہ جب درخواستیں منظور کی جا چکی ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۴ کالم ۲ پر)

سپہرِ محبّت کا تارا بنوں میں

(آنسہ) نجمہ تصدّق ایم اے، بی ٹی - ایڈیٹر ماہنامہ "ادیب" دہلی

ترا ایک نقش گوارا بنوں میں — تو پھولوں کی ڈالی ہیں یا سحر ہوں
تری عافیت کا سہارا بنوں میں — تو ہی چشمِ بینا ہیں اس کی نظر ہوں
تو دریا بنے اور کنارا بنوں میں — ترے تاج میں اک چمکتا گہر ہوں

تری آرزو کا سہارا بنوں میں — ترے رخ کا دلکش نظارا بنوں میں
سپہرِ محبت کا تارا بنوں میں — سپہرِ محبّت کا تارا بنوں میں

تو گیسو بنے اور شانہ بنوں میں — تو صبحِ تبسّم ہی میں شامِ خنداں
تری شوخیوں کا بہانہ بنوں میں — تو آغازِ خنداں میں انجامِ خنداں
ترے لب پہ رنگیں فسانہ بنوں میں — مئے حُسن تو ہی میں اک جامِ خنداں

تری چتونوں کا اشارا بنوں میں — تری مستیِ آشکارا بنوں میں
سپہرِ محبّت کا تارا بنوں میں — سپہرِ محبّت کا تارا بنوں میں

رہیں ہم رس پی کے مسرور دونوں — سراپا نظر بن کے نظارے لوٹوں
شرابِ محبت سے مخمور دونوں — میں انجم بنوں ترے دامن میں ٹوٹوں
کدورت کی دنیا سے ہوں دور دونوں — بنوں چشمہ ترے رگ و پے سے پھوٹوں

تو جلوہ بنے جلوہ آرا بنوں میں — ترے دل کی ندی کا دھارا بنوں میں
سپہرِ محبّت کا تارا بنوں میں — سپہرِ محبّت کا تارا بنوں میں

دامنِ گلفروش

از — رحیمی

میرے محبوب ———— !

زندگی کی ساعتیں کم ہوتی جا رہی ہیں ———— ! اور موت کا سرد ہاتھ میری حیات کو دبوچنے کے لئے بڑھتا چلا آ رہا ہے۔

ایک مہمان کی حیثیت سے میں آیا تھا ———— اور اب ایک مسافر کی صورت میں یہاں سے جانے والا ہوں ————

میرے اس سفر کا انتہائی سلسلہ کسی منزل پر جا کر ختم ہو گا — اور یہ بھی ممکن ہے کہ کبھی نہ ختم ہو۔

میرے محبوب !

میرے سفر کی دلہن منزل تمہارے شہر کے قبرستان میں ہوگی ———— اس سفر میں غالباً میرے ساتھ اور بھی بہت سے لوگ ہوں گے۔ عزیز و اقارب دوست احباب۔ اور ممکن ہے کچھ اور لوگ بھی ہوں کہ جو محض ہمدردیٔ انسانی کے باعث مجھے میرے مستقر پر پہونچانے کے لئے آئیں ...

یہ تمام لوگ مجھے یہاں تک پہونچا کر واپس چلے جائیں گے ———— اور پھر میرا تنہا سفر شروع ہو گا !

میرے محبوب ! — — — — — —

جب تمہیں یہ معلوم ہو گا کہ میں سب سے ہمیشہ کیلئے جدا ہو کر کسی لامعلوم جگہ کے لئے روانہ ہو گیا ———— تو تمہیں کس قدر افسوس ہو گا ———— — — شدتِ الم سے ممکن ہے تمہاری چیخیں نکل جائیں اور امنڈ امنڈ کر آنے والے گرم گرم آنسو تمہارے کملائے ہوئے رخساروں پر ایک خط قائم کر دیں۔

تم ان دنوں کو یاد کرو گی کہ جب بچپن میں ہم لوگ آپس میں لڑا کرتے تھے اور پھر مل جاتے تھے اور تمہیں وہ زمانہ بھی یاد آئے گا کہ جب شباب کے نشہ آور لمحات نے تمہیں ایک خوددار محبوب بنا کر ایک مدت تک تم کو مجھ سے محترز بنا دیا تھا۔

تم اس گھڑی کو بھی سوچو گی کہ جب میری محبت کی سوگواری سے متاثر ہو کر ایک چاندنی رات میں اپنے باغ کی مہندی کی روش کے درمیان مجھ سے تم نے پہلی بار اقرارِ محبت کیا تھا۔

لیکن ———— میرے بعد، مجھ سے متعلق گذری ہوئی باتوں کو سوچنا ایک فعلِ عبث ہو گا

میرے محبوب ! ————

تمہاری ہچکیاں ———— آنسو اور تمہاری سرد آہیں مجھے تلاش کریں گی اور نہ پائیں گی۔

تمہاری بے قرار نگاہیں اور بے چین نگاہیں اور تمہارا اُترا ہوا چہرہ اور لغزیدہ قدم۔ مجھے ڈھونڈھیں گے اور میں نہ مل سکوں گا — — تمہارے لئے میں ایسا ہی ہو جاؤں گا کہ جیسے تم نے مجھے دیکھا ہو لیکن خواب میں !

میرے محبوب . ————

یہ سچ ہے کہ میں تم سے اور ہر چیز سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جاؤں گا۔

یہ سچ ہے کہ میں تمہیں اور نہ کسی دوسرے کو اس عالم رنگ و بو میں پھر نظر آؤں گا۔

یہ بھی صحیح ہے کہ کچھ دن بعد حوادثاتِ روزگار میرے مرقد کا آخری نشان تک صفحۂ عالم سے محو کر دیں گے

اور غالباً یہ بھی صحیح ہے کہ کچھ مدت بعد دنیا مجھے فراموش شدہ حقیقت کا درجہ دیدے گی۔ لیکن اگر تم یقین کر سکتی ہو تو یقین کر و کہ۔

میرے محبوب ! ————

اگرچہ میرا گوشت اور پوست یقیناً فنا ہو جائے گا میرے ظاہری اعضا اور یہ شکل مٹ جائیں گے لیکن میں ————

وہ شئے کہ جو حیاتِ انسانی کو کلفتوں کے برداشت کرنے کے قابل بناتی ہے ———— وہ جو ہر کہ جو احساس محبت کرتا ہے اور دو دلوں کو ایک رشتہ سے منسلک کرتا ہے ———— وہ روشنی، کہ جو زندگی کی گذرگاہوں میں انسان کے لئے مشعلِ ہدایت بنتی ہے ———— وہ کبھی نہ فنا ہوگی، وہ ہمیشہ باقی رہے گی،

میرے محبوب ! ————

میرے بعد میری یاد میں آنسو نہ بہانا اور نہ غمگین ہونا —

میرے بعد مجھ کو یاد کر کے سرد آہیں نہ بھرنا اور نہ افسردہ ہونا۔ محبت کا وہ شعلہ کہ جو کبھی میرے سینے سے نکل کر تمہارے وجود کو گرما گیا تھا محبت کی وہ روشنی کہ جس نے کبھی تمہیں اپنے حلقہ میں لے لیا تھا وہ میرے بعد بھی باقی رہے گی۔

اور جب میرے بعد تم اپنی تنہائیوں میں کسی خیال سے الجھی ہوئی ہوگی اور پھر جب تمہارا خیال دفعتہً میری یاد تمہیں دلائیگا ———— اس وقت بھی میں تمہارے آس پاس موجود ہوں گا۔

پھر میرے بعد تمہیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ؟ . .

میرے بعد رنجیدہ ہونا کیا ضرور .... ؟

میرے محبوب ! ————

"میں" وہ نہیں ہوں کہ جو گوشت پوست کی صورت میں ہے بلکہ - میں " ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ ایک نہ مٹنے والا نغمہ ہے۔ ایک نہ بجھنے والی شمع ہے ———— ہر شے فنا ہو جاتی ہے لیکن محبت کو عمرِ دوام عطا کی گئی ہے !

حسنِ معصوم سے ———— !

جب میں تیری طرف دیکھتا ہوں تو کیا بات ہے کہ میرے جسم میں ایک کپکپی سی دوڑ جاتی ہے ———— ؟

تیری معصوم نظریں بار بار مجھ پر پڑیں اور ہمیشہ جھک گئیں — — اس طرح جھک گئیں کہ جیسے کوئی سفید فاختہ تھک کر اپنے بازو ڈالدے پھر جب جب ایسا ہوا مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کوئی برقی رو میرے جسم میں دوڑ گئی ہو —— جیسے کسی بے پایاں مسرت کے سمندر میں میں ڈوبا چلا جا رہا ہوں۔

میں روز گاؤں کے کنوئیں پر تیرا انتظار کرتا رہتا ہوں ———— اور سوچا رہتا ہوں کہ کیا کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ میں تیرا گھڑا بھر کر تیرا انتظار نہ کروں اور اپنی زندگی کو بھی بستر اسد کھو سکوں۔

آہ، جب تو اپنی حنائی لانبی پتلی انگلیوں سے اپنا ڈول کنوئیں سے کھینچتی ہے تو تیرے ہر جھٹکے پر مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے سارے جسم کی روح سمٹ کر آنکھوں میں آ گئی۔

اور جب تو اپنا بھرا ہوا ڈول چھلکاتی ہوئی اپنے گھر کی طرف واپس ہوتی ہے۔ تو میں آرزو کیا کرتا ہوں کہ کاش میں کوئی ذرہ ہوتا جو تیری راہ میں پڑا ہوتا جس کو تو پامال کرتی ہوئی گذر جاتی۔

اے حسنِ معصوم ! حالانکہ میری راتیں تیرے خیال سے روشن ہیں۔ میری تنہائیاں تجھ سے سرگرم گفتگو ہیں۔ میرا خیال تجھ سے محو اختلاط ہے۔ میرا تصور تیری ہستی میں ڈوبا ہوا ہے۔ لیکن اے ملیحی ! میں کبھی نہیں چاہتا کہ تو میری طرف ان کیف بار نظروں سے ایک بار بھی دیکھے کہ جن میں خواہش سپردگی ہو۔ میں کبھی نہیں چاہتا کہ چلتے چلتے تو اپنی کسی سہیلی سے راستہ میں باتیں کرنے لگ جائے۔ اس حال میں کہ میں وہاں کھڑا ہوا ہوں۔

میں یہ بھی نہیں پسند کرتا کہ تیرے سر کا آنچل مجھ کو دیکھ کر خواہ مخواہ تیرے شانوں پر آ جائے اور تیری نیچی نگاہیں بار بار آنچل کو سر پر ڈالنے میں ڈھونڈھ جائے۔

مجھے یہ بھی پسند نہیں کہ جب میں تیرے گھر کے سامنے سے گذروں تو تجھے اس حال میں پاؤں کہ تو اپنی سہیلیوں سے چہل کر رہی ہو اور مجھے دیکھنے کے بعد بھی تو سنجیدہ نہ بن سکے۔

میں تو چاہتا ہوں کہ تو اگر کبھی مجھے دیکھے تو بے اعتنائی کیساتھ اپنی گردن موڑ لے۔

مجھے یہ پسند ہے کہ اگر میں تیرے دروازے پر کسی ضرورت سے آؤں تو میرے بار بار آواز دینے پر بھی تو خاموش رہے۔

مجھے یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ جب راستہ میں اتفاق سے تو میرے سامنے آ جاتے تو ایک جھجک کیساتھ مجھ سے کترا کر علیحدہ ہو جائے۔

تیری بے اعتنائیوں اور کج ادائیوں میں میری محبت کا راز پوشیدہ ہے۔

تیرے تغافل اور تجاہل میں میرے ارمانوں اور آرزوؤں کی زندگی ہے !

(ختم شد)

دوسری قسط

از
محترمہ
ملکہ اسماعیل صاحبہ
بمبئی

میں نے یہ الفاظ اگرچہ مجبوری کہے تھے لیکن کرتا کیا۔ میں نے ان کے ہاتھوں میں ان کا چھوٹا ہوا چمڑے کا بیگ دیکھ لیا تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر زیتون کو میں چچا کے رحم وکرم پر چھوڑ کر گیا۔ تو پھر مجھے زیتون صحیح وسلامت نہیں ملنے کی!

میں نے چچا سے دریافت کیا "آپ کلب کس وقت چلیں گے تاکہ میں ٹیلیفون کر کے ایک کورٹ مخصوص کرا لوں"

"اگر سچ پوچھو تو سلیم! میں تمہارے ساتھ ابھی کھیلنا نہیں چاہتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میری مشق چھوٹی ہوئی ہے۔ میں پہلے تھوڑی مشق کرنا چاہتا ہوں"

لیکن چچا! ہم کوئی میچ تھوڑی ہی کھیل رہے ہیں معمولی طور پر دو تین سیٹ کھیلیں گے اور پھر وہیں دوپہر کا کھانا کھا کر شام کو کھیلیں گے۔

اصل میں میرا ارادہ قطعی چچا کو لے جانے کا نہ تھا لیکن کچھ تو اس خیال سے کہ اگر چچا کو میں مکان ہی پر چھوڑ کے جاتا ہوں، تو نہ جانے میری عدم موجودگی میں کونسی واردات قابل رشک اندازی پولیس کر بیٹھیں۔ ابھی اسی دن باورچی خانہ کی چھت توڑ ڈالی تھی۔ ملازمہ کو ایسا جلایا کہ وہ آج تک اسپتال میں پڑی ہوئی چچا کی جان کو رو رہی ہے۔ زیتون کا ہاتھ زخمی کیا۔ پھر کوئی کیا جانے کہ میرے گھر سے جانے کے بعد اب وہ اپنی کس ایجاد کو تکمیل کا جامہ پہنائیں۔ اس کے علاوہ زیتون نے بھی مجھ سے کہہ دیا تھا کہ چچا جب تک گھر میں رہیں۔ تم بھی رہو اور اگر تمہیں کہیں جانا ہی ہو تو انہیں بھی اپنے ہمراہ لیسکر جاؤ۔ اب میں تو چچا کی خرافات میں اپنا دن ضائع کرنے سے رہا۔ اسی لئے چار و ناچار چچا سے کلب چلنے کی درخواست کی۔ پہلے تو وہ ساتھ چلنے پر راضی نہ ہو رہے تھے۔ لیکن جب بہت منت سماجت کی تو چچا دکھی پھیکی آواز میں بولے "خیر اگر تم چلنے کے لئے مجبور ہی کر رہے ہو۔ تو چلا چلوں گا۔ لیکن دیکھو بھئی اس وقت تو میں تم سے مشق کے طور پر کھیلوں گا اور مجھے اس کا یقین ہے کہ اس وقت خواہ میں خراب کھیلوں لیکن شام کو جب ہم کھیلیں گے۔ تو تمہارا کھیل میرے کھیل سے بہتر ثابت نہ ہوگا۔ اور آخر میں تمہیں شکست ماننی پڑے گی"

"ارے چچا" میں نے چچا کو خوش کرنے کے لئے کہا "میں تو آپ کے سامنے کا بچہ ہوں۔ آپ کے سامنے میں کیا اور میرا کھیل کیا؟"

چچا ارے خوشی کے غبارہ کی طرح پھول کر کئی انچ لمبائی میں اور کم ہو گئے۔ بڑے تمکنت سے فرمایا "تم یہ نہ سمجھنا کہ میں ٹینس کھیلنا بھول گیا ہوں۔ اگر تم میرا کھیل دیکھو تو تمہیں ماننا پڑے گا کہ میری سروس اب کتنی اچھی ہو گئی ہے"

"بڑی خوشی کی بات ہے چچا" میں نے ان کی اس بے جا خود ستائی سے ذرا چڑھ کر کہا "گذشتہ بار بھی جب آپ مجھ سے کھیلے تھے۔ تو آپ مجھ سے ہار گئے تھے"

"خیر" چچا بولے۔ "اس وقت کو بھول جاؤ۔ لیکن اب تم دیکھنا ——تم اپنے آپ کو بڑا اچھا کھلاڑی سمجھتے ہو۔ لیکن آج —— ہی تم دیکھ لینا" چچا کا پارہ ذرا چڑھا ہوا تھا۔

ممکن ہے چچا کبھی ٹینس اچھی کھیلتے ہوں۔ حالانکہ ان کے بونے قد اور چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں سے مجھے یہ امید نہیں کہ کبھی وہ اپنے حلقہ احباب میں بہترین کھلاڑی تسلیم کر لئے گئے ہوں۔ لیکن آج چچا کے کہنے کا انداز اور وثوق کچھ اس طرح یقین دلا رہا تھا کہ میں بھی یہ سوچنے کے لئے مجبور ہو گیا کہ کیا واقعی چچا مجھ سے بہتر کھیل سکیں گے۔ میں متعجب ہو کر چچا کو دیکھنے لگا۔ یہ کیسے ممکن ہے میرا یہ اندازہ غالباً غلط نہیں کہ چچا خواہ دنیا بھر کی خرافات ہو جائیں۔ لیکن ٹینس کے اچھے کھلاڑی کبھی نہیں ہو سکتے۔

چچا تھوڑی دیر غور کر لینے کے بعد بولے "دیکھو! میں نے اس پر بہت کچھ سوچا ہے اور ٹینس کے متعلق بہت سی کتابیں بھی پڑھی ہیں "ٹلڈن" اور "پیری" وغیرہ سب ہی کتابیں تو دیکھ ڈالیں"

چچا ایک فلسفی کی طرح تقریر فرما رہے تھے اور میں اپنی ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں چچا کے سامنے سر کو خم کئے ہوئے تھا۔

"مجھے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لکھنے والے ہمیشہ اصل چیز کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مثلاً یہ لوگ کہتے ہیں کہ جیسی سروس پر ٹینس کا دارو مدار ہے۔ یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ جب گیند سروس کے لئے اچھالی جائے۔ تو ہاتھ کو اس طرح اٹھایا جائے" چچا نے ایک خاص انداز سے بھاؤ بتاتے ہوئے کہا "اور جب گیند بلّا کے پاس ایک خاص نقطہ پر پہونچے۔ تو ہاتھ کو ڈھیلا کر کے اس طرح گیند پر بلّا مارنا چاہئے کہ گیند بجائے بالکل سیدھا جانے کے ذرا ڈھلوان طریقہ سے فریق مخالف کے پاس پہونچے۔ لیکن ان لوگوں نے یہ کہیں بھی نہیں لکھا کہ ہاتھ کو کس طرح گھمانا چاہئے اور کلائی کو گیند پر ضرب پہونچاتے وقت کتنا موڑنا چاہئے۔"

"بہت خوب چچا جان۔ بہت خوب!" میں نے کہا "میں تو آپ سے قطعی متفق ہوں" مجھ کو کچھ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے بجائے چچا جان کے مجھ سے کوئی "فٹ بال" ٹینس کے متعلق گفتگو کر رہا ہو۔ ذرا آپ بھی اپنی جگہ پر غور کیجئے کہ چار فٹ گیارہ انچ کا اگر کسی کا قد ہو اور اس کی توند کا قطر پورے اڑتالیس انچ ہو اور پھر وہ ٹینس جیسے غیر معمولی کھیل کے رموز ونکات کو اس طرح بیان کرے کہ جیسے انہیں کے بزرگوں نے تو اس کھیل کو ایجاد فرمایا تھا اور اب تنہا وہی اس کے "نام لیوا" رہ گئے ہیں —— تو آپ کا کیا حال ہو؟ —— میری جان ان کی باتوں پر جل رہی تھی۔ لیکن کرتا کیا۔ سنتا رہا۔

"دیکھو سلیم" چچا جان گل افشانی فرما رہے تھے "میں نے اس پر بہت سوچ وخوض کیا اور آخر میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ ایک کھلاڑی کے اندر محض قوت ہی کا ہونا کافی نہیں۔ بلکہ پھرتی اور چالاکی سے بھی بڑھ کر کسی ایسی چیز کی ضرورت ہے کہ جو بالکل ایک مشین کھلاڑی کو بنا دے۔ چنانچہ بہت کچھ غور کرنے کے بعد میں ایک اس قسم کا آلہ بنانے میں کامیاب ہو گیا کہ بالکل نو مشق کھیلنے والے کو بھی وہ تھوڑی دیر میں ٹینس کا ماہر کھلاڑی بنا دے"

لاحول ولا ..... پھر وہی مشین کا ذکر آ کر کا تذکرہ۔ ان کی ایجادوں نے تو میرا ناک میں دم کر دیا۔ ہر چیز میں ایجاد، ہر کام میں جدت۔ اب بیٹھے بٹھائے اس کھیل کو دکی چیزوں کے متعلق بھی مشینیں اور آلات ایجاد کرنے شروع کر دیئے۔ اب مجھے یہ فکر لگی کہ چچا اگر کلب گئے تو یقیناً اپنی اس نئی اولاد کو بھی ضرور اپنے ساتھ لے جائیں گے اور وہاں نئے اور اجنبی لوگوں میں اس کا مظاہرہ وہ ضرور کریں گے اور پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کی یہ ایجاد ہوگی آخر کس قسم کی۔ اتنے میں زیتون بھی۔ لوگوں کے پاس پہونچی میں نے ڈرتے ڈرتے چچا سے پوچھا کہ چچا آپ کی یہ نئی ایجاد آخر کس قسم کی ہے۔ کیا کوئی بہت بڑی مشین ہے۔

چچا نے فخریہ طور پر مسکراتے ہوئے کہا "نہیں بہت چھوٹی سی چیز ہے۔ اس کو ایک خاص طریقہ سے فٹ کرنا ہوگا۔ اور اس میں مجھے زیتون کی امداد کی ضرورت ہوگی۔"

یہ سنکر زیتون تو بالکل زرد پڑ گئی۔ میں بھی حیرت زدہ ہو رہا تھا کہ آخر یہ مشین کس قسم کی ہوگی۔ اس مشین کا تعلق "ٹینس لان" سے ہوگا کہ گیند یا بلّا سے کہ جو ایک نو مشق کھلاڑی کو بھی کہنہ مشق تھوڑی دیر میں بنا دے۔ زیتون نے افسردگی سے پوچھا۔ "کونسی مشین ہے چچا جان"

چچا بولے "کوئی مشین نہیں ہے زیتون، بلکہ یہ ایک چھوٹی سی چیز ہے کہ جو سائنس کے اصول "الاسٹک سٹی" کے پیش نظر تیار کی گئی ہے۔"

میں حیرت سے چچا کی باتیں سن رہا تھا اور ان کی اس قابل مبارکباد ایجاد کے متعلق سوچ رہا تھا کہ آخر وہ کس قسم کی ہوسکتی ہے اور وہ حضرت تھے کہ اطمینان سے مسکرا مسکرا کر کبھی مجھے اور کبھی زیتون کو تکتے۔ تھوڑی دیر تک اپنی جیبوں کو ٹٹولتے رہے اور پھر اس میں سے ایک چھوٹا سا پیکٹ نکالا۔ ہم لوگ غیر اختیاری طور پر ان سے اور قریب ہو گئے کہ ان کی اس نئی اور نرالی ایجاد کو پہلی ہی نظر میں اچھی طرح سے دیکھ اور سمجھ سکیں۔ محترم چچا نے جب اس چھوٹے سے پیکٹ کو کھولا۔ تو اس میں سے "آکٹوپس" قسم کی ایک چیز نکلی۔ گویا کوئی ایسی ایک بڑی مکڑی ہے کہ جو اپنی ظالمانہ حرکات شروع کرنے کے لئے اپنے لانبے لانبے ہاتھوں کو کھولے ہوئے ہے۔ یہ تو سرسری نظر سے معلوم ہو رہا تھا——

لیکن زیادہ غور کرنے سے وہ ایک عجیب قسم کی بھیانک شکل کی چیز دکھائی دے رہی تھی۔ یعنی ہر طرف ربڑ کی باریک اور موٹی پٹیاں نظر آ رہی تھیں۔ جن کی ابتدا ایک لوہے کے حلقہ سے ہوتی تھی اور ان کے آخری سروں میں ہک لگے ہوئے تھے بعض پٹیاں بہت ہی بڑی، بعض متوسط اور بعض چھوٹی۔ اسی طرح بعض موٹی اور بعض پتلی تھیں اور لطف تو یہ کہ ہر ایک پر میبل بھی چپاں تھا۔ گویا پرچہ ترکیب استعمال بھی ساتھ ہی ساتھ تھا۔ میں نے آہستہ سے پوچھا کہ "چچا بھلا یہ کام کیسے دیگا"

چچا بولے "سلیم! تم تو رہے بیوقوف ہو۔ ارے بھئی تم سے میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ یہ ایجاد سائنس کے اصول اور "الاسٹک سٹی" پہ تیار کی گئی ہے۔ یہ جتنی پٹیاں ہیں سب اپنے اپنے کام کو وقت پر انجام دیں گی۔ دیکھو یہ چھوٹا سا ہک۔ بس اگر میں اس کو پہن لوں اور اس پٹی کو کھینچ کر اپنے بازوں میں لگا دوں تو قدرتی طور پر میرا ہاتھ اوپر کو اٹھنے لگا۔ بس یہ ہے اس کا اصول۔ اور یہیں پر ہمارا مدعا پورا ہو جاتا ہے"

"چچا معاف فرمائیے" میں نے کہا "مجھے خواہ آپ بیوقوف کہئے یا میرے دماغ پر لعنت ملامت کیجئے لیکن میں اب تک واقعی بالکل نہیں سمجھ سکا۔"

چچا نے مشفقانہ انداز میں ایک استاد کی طرح سمجھاتے ہوئے کہا "دیکھو یہ جو حلقہ ہے یہ میری قمیص کے اندر ہی دبا جائے گا اور اسی طرح ربڑ کی پٹیاں جو ہیں وہ قمیص کے اندر ہی اندر میرے بازو کی طرف اور اسی طرح دوسرے اعضا کی طرف لگائی جائیں گی۔

زیتون بولی "لیکن چچا یہ جو باریک اور لمبی ربڑ کی پٹیاں ہیں ان کا کیا ہوگا؟"

"میری بائیں کلائی کی طرف یہ پٹیاں جائیں گی" چچا نے فرمایا۔

"جب گیند پھینکنے کا وقت ہوگا تو جھٹکے سے میرا بایاں ہاتھ فطری طور پر اچھلے گا اور ساتھ ہی ساتھ میرا داہنا ہاتھ بھی گیند پکڑنے کے لئے تیار ہو جائے گا۔

"لیکن چچا اس طرح تو دونوں ہاتھ ہوا ہی میں قائم ہو جائیں گے" زیتون نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ارے تو بھی ابتک نہیں سمجھی" اوپر کا ربڑ ڈھیلا رہیگا جب میں اپنے ہاتھ کو اٹھاؤں گا تو ربڑ تننے لگا اور پھر بعد میں خود ہی الاسٹک کے سبب نیچے آجائے گا؟"

یہ سب کچھ چچا فرما رہے تھے اور ہم چچا کی بکواس پر چکر آ رہا تھا بخیر خدا کا شکر ہے کہ کھانے کا وقت آگیا اور ہم سب لوگ کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔ (باقی)

بسلسلہ عمر خیام

۱۶ر نومبر سنہ ۱۹۴۱ء

جناب سلطان شریف صاحب بی اے بمبئی

وہ قوت جو کل نظام جاری و ساری ہے اس کے وجود میں انسان کی اہمیت کو محسوس کرنے کے معاملہ میں عمر نہ تو سب سے پہلا آدمی ہے اور نہ سب سے آخر۔ عمر کا خیال ہے کہ کائنات کی پشت پر ایک نہایت ذہین و فطین طاقت کام کر رہی ہے اور وہ کسی ایسے نامعلوم مقصد سے جس کا اس کے سوا کسی کو علم نہیں۔ دنیا کو چلا رہی ہے۔ عمر کے نزدیک زندگی یہ ہے۔

زندگی ایک خیمہ ہے جہاں ملک عدم کو جانے والا سلطان ایک دن کے لئے قیام کرتا ہے۔ جب یہ سلطان چلا جاتا ہے تو پھر یہ خیمہ کسی اور کے لئے سجایا جاتا ہے۔

زندگی شطرنج کی بساط ہے۔

رباعیات کے آخری حصہ یعنی کوزہ نامہ میں عمر کوزہ گر، کوزہ اور خدا کے درمیان ایک خط مستقیم کھینچتے ہوئے پوچھتا ہے کوزہ گر کون ہے؟ اور کوزہ کون ہے؟ یہاں شاعر کوزہ کے ہر ٹکڑے کو ایک انسان قرار دیتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کو اپنی بناوٹ اور ساخت کے اعتبار سے دوسری تمام مخلوق کی طرح ناکمل قرار دیتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کو اپنی بناوٹ اور ساخت کے اعتبار سے دوسری تمام مخلوق کی طرح ناکمل قرار دیتا ہے یہ ناکمل کوزے جو ابھی اسی کوزہ گر کے ہاتھ سے بنکر آئے ہوئے ہیں۔ اپنی اپنی حالت بیان کرتے اور اپنی کمزوری کے متعلق عذر پیش کرتے ہیں۔

ذرا سے وقفہ کے بعد ایک ناکارہ برتن نے مجھ سے کہا کہ جب ہمیں بنایا جا رہا تھا۔ اس وقت کوزہ گر کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

اب ایک دوسرے پیالے نے کہا۔

ایک چھوٹا بچہ بھی اس پیالے کو نہیں توڑتا جس سے اس نے لطف اٹھایا ہے۔

عمر کے نزدیک انسان کی حیثیت ایک قطعی ناقابل ذکر کھلونے کی سی ہے۔ جسے اس طاقت نے کسی نامعلوم مقصد کے لئے بنایا ہے چنانچہ عمر کا ایمان ہے کہ خالق اپنے غیر تکمیل یافتہ بچوں سے اس سے زیادہ مطالبہ نہیں کرے گا۔ جتنا اس نے انھیں دیا ہو خیام کا خیال ہے کہ انسان کی تعمیر ہی اس قسم کی ہوئی ہے کہ وہ ذرا سی لالچ میں بہک سکتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے اعمال کا ذمہ دار قرار نہیں دیا جائے گا۔

اے خدا تو نے انسان کو ناچیز مٹی سے بنایا ہے اور بہشت بنا کر اس میں سانپ کو بھی چھوڑ دیا ہے! جس کی وجہ سے انسان گناہوں سے زیادہ ہو چکا ہے لہٰذا ہم تجھے معاف کرتے ہیں اور اسی طرح تو بھی ہم کو معاف کر دے۔

یہ کسی ایسے بزدل آدمی کی دعا نہیں ہے جو اپنے نفس کو تسکین دینے کے لئے معافی مانگ رہا ہو بلکہ یہ ایک ایسی بلند روح کی پکار ہے جو اپنی زندگی کی کمزوریوں کے لئے نجات کی طالب ہے اور جو اپنے خالق کے اس جرم کو کہ اس نے اسے خلق کیا معاف کرتی ہے۔

رباعیات کے ایک عام پڑھنے والے کے لئے رباعیات کے اندر شہوانی ترغیب اور شراب کی رغبت کے سوا اور کچھ نہیں سکتا ہے ہو سکتا ہے کہ عمر خود شراب نوشی کا عادی ہو۔ مگر اس نے اپنی شاعری میں جو کچھ کیا ہے اس کی حیثیت محض ثانوی ہے۔ عمر جام میں زندگی کے مقاصد سے ایک خاص مقصد دیکھتا ہے اس کی "اندھی ذہانت" اس کو بھی تسکین دینے میں ناکام ثابت ہوئی ہے۔ فلسفہ اور فقہ اس کے ذہن کو مطمئن کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے انھوں نے زندگی کے جو نظریات پیش کئے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی باہمی تردید کرتے ہیں۔ اور وہ بالکل کھوکھلے اور غلط ہیں وہ ایک طرح سے جام شراب کو طاق نسیاں پر رکھکر زندگی کی حقیقت کو سمجھ نہیں پاتا ہے۔ مگر [illegible] وہ اپنی اس کی [illegible] ہو چکا ہے۔ چنانچہ وہ بالکل مایوس ہونے کے بعد اپنی مایوسی کا ایک مقام پر نہایت درد انگیز پیرایہ میں اس طرح اظہار کرتا ہے۔

ہمیں خاک کے نیچے بغیر شراب، بغیر محبوب اور بغیر مطرب اس طرح سونا ہے کہ ہماری نیند کا کوئی اختتام نہیں۔ اس لئے اس وقت تیرے پاس جو کچھ بھی ہے اس سے جی بھر کے عیش کر لے!!!

"جمال"

کیا مایۂ صد ناز ہیں انداز جمال
وجہ طرب زیست ہو آواز جمال
فطرت کے اشاروں پہ یہ بجتا ہے مدام
مضراب کا محتاج نہیں ساز جمال

"حسن"

مسجود ملائک کا بھی حاصل ہے
انوار حقائق کا بھی یہ حامل ہے
ہے خانۂ دل بارگہ صد نازش
اور حسن حقیقت میں خدائے دل ہے

(رونق دکنی از جمشید پور)

شاد عظیم آبادی کی اردو شاعری

(یہ مضمون حیدرآباد دکن کی ایک ادبی مجلس کے لئے لکھا گیا تھا)

(از: حضرت مظفر حسین صاحب شمیم)

جب شہزادہ عظیم الشان نے صوبہ بہار کی حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی۔ اور چند روز تک صوبہ دار رہا تو انہوں نے راجدھانی پاٹلی پتر کو عظیم آباد کا نام دے کر اپنا صدر مقام بنایا [illegible] نظر آنے لگا۔ شاعروں کے لئے یہ شہر [illegible] سازگار ہوتی ہے۔ یوں تو اس سے پہلے بھی یہاں [illegible] اردو شعر و شاعری کا چرچا تھا [illegible] اردو شاعری نے خوب پھل پھول [illegible] اشرف علی خان فغاں اور فارسی کے بلند پایہ شاعر [illegible] پیدا ہوا۔ وہ یہیں شعر کہتے تھے (؟) [illegible] یادگار رہیں۔

شہزادہ عظیم الشان [illegible] کے بعد [illegible] انقلابات کا عظیم آباد کی علمی اور ادبی فضا پر بھی اثر پڑا۔ اگرچہ اب انقلابات کی وجہ سے اس شہر میں شعر و شاعری کی وہ اگلی سی گرم بازاری نہ رہی تھی، مگر وہ [illegible] کی کاوشوں سے اٹھایا گیا۔ اور لوگوں کی طبیعت کا جزو بن چکا تھا کیا کسی طرح زائل ہو سکتا تھا۔ بدستور مشاعروں کی محفلیں گرم ہوتیں، اور مرثیہ و سوز خوانی کی مجلسیں برپا ہوتی تھیں، انیس اور دبیر اکثر عظیم آباد آتے اور اپنے کلام کی داد پاتے تھے۔ اس وقت مشرقی ہند میں شاہ الفت حسین فریاد عظیم آبادی کی استادی کا جھنڈا گڑا ہوا تھا۔ شاد عظیم آبادی نے شاہ صاحب موصوف ہی کے دامن تربیت میں نشو و نما پائی تھی۔

شاد کے کلام میں میر تقی میر، خواجہ میر درد، اور خواجہ آتش کی بہت سی خصوصیات پائی جاتی ہیں ـــ یہ خصوصیات غیر محسوس طریقے پر ان کے کلام میں آگئی ہیں۔ اور انہوں نے ان کی طبیعت سے کچھ ایسا میل کھایا۔ کہ ان کے ملاپ سے شاد کا ایک علیحدہ رنگ قائم ہوگیا۔ شاد نہ تو غالب کی طرح مفکر ہیں۔ اور نہ اقبال کی طرح فلسفی۔ وہ فقط شاعر ہیں اور وہ بھی عشق کے شاعر، خواہ ان کا عشق انسانی روپ میں ہو یا تصوف کے بہروپ میں، وہ محض ایک عاشق ہیں اور وہ بھی محروم عاشق! اسی لئے ان کی شاعری میں ایک خاص قسم کا سوز وگداز پیدا ہوگیا ہے۔ مثال کے طور پر چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم
میں حیرت و حسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم

شب کو مری [illegible] حسرت کا دکھ درد سہا ان سے کہہ جب [illegible]
[illegible] کچھ سوچ کے [illegible]
مانا کہ فقط موہوم ہے ہمیں ملنے کی مگر اک آس تو ہے،
دیدار تو ہو لے دیدۂ تر بہتا ہو، اگر تب بہہ اپنا،
ہم باغ میں ناحق آئے تھے، جس کی غنیمت کیا کہئے!
[illegible] کلیوں پہ کچھ اپنی زبان میں کہہ جا

یہاں نہ نشو و نما کا حاصل نہ کوئی ثمرہ ہے جگر و لہو کا
ہنسو گے تم اے چمن میں غنچو زمانہ آ لے ذرا نمو کا،
کبھی کو آب و ہوا موافق ہوئی نہ اس باغ تیرہ فضا کی
ہمیشہ مرغ چمن کراہے ہمیشہ پھولوں نے خون تھوکا
پکار کر دشمنوں سے کہہ دو خزاں کا بھی دور ہے غنیمت
قبا کے دامن کو ٹانک لیں اگر نہ موقع ملے رفو کا
ابھی بہت دل میں ہیں امیدیں تڑپ کے حسرت سے مر نہ جائے
بلا سے اگر شاد سے عزیزو، تو ذکر کرنا نہ آرزو کا،

شاد میں درد و اثر کی اس قدر فراوانی ہے کہ یہ رنگ ان کی نعتوں میں بھی جھلکتا ہے۔ نعت کے میدان میں فارسی میں نظامی اور امیر خسرو بہت مشہور ہیں۔ اردو میں میر حسن ـــ دیا شنکر نسیم۔ محسن کاکوروی۔ بیان یزدانی اور مولانا ظفر علی خاں نے بڑے مرتبے کی نعتیں لکھی ہیں۔ شاد نے اس پامال زمین میں بھی اپنے لئے الگ راہ نکالی ہے۔ فرماتے ہیں: ؎

اپنے گدا کو خود وہ پکارے، اٹھ مرے کالی کملی والے
اٹھ میرے عاشق اٹھ مرے پیارے اٹھ مرے کالی کملی والے
چاند کی رنگت زرد ہے پیارے صبح کے دیکھ آثار ہیں سارے
ڈوب چلے دم بھر میں ستارے اٹھ مرے کالی کملی والے
رات چلی ہے جوگن ہو کر اوس ہے اپنے منہ کو دھو کر
لٹ جھٹکائے بال سنوارے اٹھ مرے کالی کملی والے

ان کی شاعری میں درد و تاثیر کے علاوہ ایک قسم کا والہانہ اور قلندرانہ انداز بھی پایا جاتا ہے۔ اس باب میں وہ خواجہ آتش کے ہم زبان نظر آتے ہیں۔ مثلاً فرماتے ہیں ؎

نہ آئینے کا قصہ اور نہ حال شانہ کہتے ہیں
حقیقت میں جمال یار کا افسانہ کہتے ہیں،
ہنسانا اور رلانا بے وفا دنیا کی خصلت ہے
ہم اس انداز کو انداز معشوقانہ کہتے ہیں
ازل سے اپنی گردن پر ہے احسان اپنے پہلو کا
خدا جانے کیسے ساقی کیسے پیمانہ کہتے ہیں!

یا یہ کہ: ؎

موج پیمانہ تقدیر ہے گیسو تیرا
طاق میخانہ توحید ہے ابرو تیرا
کچھ اشاروں ہی سے کہہ دے تری چتون کے نثار
کس پہ تولے ہوئے تلوار ہے ابرو تیرا
مہک اٹھا چمن دہر کا پتہ پتہ
راز چھپنے نہیں دیتی تری خوشبو تیرا

شاد کی زبان بہت منجھی ہوئی ہے۔ روزمرہ اور محاورہ پر انہیں پوری پوری قدرت ہے۔ ان کے کلام میں ہر جگہ اس کا ثبوت ملتا ہے۔ ان کے ہاں لفظی اور معنوی صنعتوں کی بھی کوئی کمی نہیں۔ مگر یہ خود بخود آگئی ہیں۔ کہیں ایسا نہیں معلوم ہوتا۔ کہ زبردستی لائی گئی ہیں۔

کبھی کبھی وہ اپنے اصلی رنگ سے ہٹ کر بھی کوئی ایسا شعر کہہ جاتے ہیں۔ جو اپنی نظیر آپ ہوتا ہے مثلاً فرماتے ہیں ؎

دیکھا کئے وہ مست نگاہوں سے بار بار!
جب تک کہ جام آئے کئی دور ہو گئے،

یا یہ کہ ؎

بدلی وہ وضع طور سے بے طور ہو گئے،
تم تو شباب آتے ہی کچھ اور ہو گئے،

ان کی اصلی شاعری سرتاسر داخلی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ وہ ماحول کی ترجمانی اپنی طبیعت کے رنگ اور ذاتی رجحانات کے مطابق کرتے ہیں۔ اس قسم کی شاعری کے لئے اردو میں غزل ایک بہت اچھا ذریعہ ہے۔

بخلاف اس کے انہوں نے جہاں واقعاتی شاعری کی طرف توجہ کی ہے۔ یعنی اشیاء کو ان کے حقیقی رنگ میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ ناکام نظر آتے ہیں۔ مثلاً انکی مثنوی "مادر وطن" اور "ابر رحمت" میں کوئی دلکشی نہیں پائی جاتی۔ اسی طرح ان کے جو مرثیے ملتے ہیں۔ ان سے ان کی قادر الکلامی کا ضرور اندازہ ہوتا ہے۔ مگر ان مرثیوں کو اس صف میں جگہ نہیں دی جا سکتی جو وحید۔ انیس۔ دبیر اور مونس کے لئے مخصوص ہے۔ کہیں کہیں ان کی غزلوں میں ایک دو شعر ایسے بھی پائے جاتے ہیں۔ جو ذوق سلیم پر ناگوار گزرتے ہیں۔ مثلاً ؎

(دیکھو صفحہ ۱۸ کے کالم ۲ پر)

تاویل

از - سید ابو طاہر بی۔ ایس۔ سی (علیگ)

تمہید!

یورپ کی سیاست اور ہندوستان کا مذہب امن اور صلح چاہتے ہیں۔ لیکن ان کی مثال اُس حکیم کی سی ہے۔ جو مریض کو بیماری سے نجات دلانے کی نیت سے ہلاک کر دیتا ہے۔ اور اعمال کی صحت میں کوئی کلام نہیں۔ کہ نفرت، سوزش، تہمت کے بیش اور چنگاریوں سے امن کا فاسد پیدا کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا نے جنگ کے علمبرداروں کو نبیوں اور امن کے پیغامبروں کا شبیہ کرنے کے بعد بھیجے ہیں۔ چنانچہ مذہبی تاویل پرستوں نے مجرموں کے سامنے سے [illegible] مثلاً کہ جنت کے دروازے پر تالا مقفل کر دیا ہے۔ اور اس کی کنجی اپنے ہاتھ میں لیکر ہیولوں میں فلسفہ کی بحث چھیڑ دی ہے۔

اس صورت میں جبکہ ملا، وکیل اور قصائی متحد ہو جائیں تو یہ ایسی تثلیث بن جاتی ہے جو توحید کو شکست دے سکتی ہے۔ بیوپار وکیل، اس پرندے کی طرح جو انڈے دے نہیں سکتا لیکن سے سکتا ہے۔ [illegible] کے لئے مولوی صاحب کا محتاج ہے، اور اس کیلئے صرف ایک بانگ "مذہب خطرے میں ہے" کافی ہے۔

قصائی صاحبان ہماری قوم کے چھتری ہیں اور ہندوستان میں خانصاحبوں کے زوال کے بعد ان کے صحیح جانشین ۔۔ وہ اعتقاد کے پکے اور کانوں کے کچے ہوتے ہیں۔ اسی لئے بات بات پر چھیچھ کرتے ہیں اور گالی پہلے دیتے ہیں جب وہ دن بھر جانور ذبح کرنے کے بعد مسجد میں داخل ہوتے ہیں۔ اور مولوی صاحب ان کے سامنے جنت کے پُر کیف مناظر کی تصویر کھینچتے ہیں جس میں یاقوت کے قصر، زمرد کا سبزہ، دودھ اور شہد کی نہریں۔ حوروں کے جھرمٹ اور غلمانوں کے پرے جاذب نظر اور مرکز توجہ ہو جاتے ہیں۔ تو وہ مولوی صاحب سے بڑا اہنگا سودا کر لیتے ہیں۔

دراصل سماج نے سب کو نقد رقم اور مولوی صاحب کو اُدھار ثواب تقسیم کیا ہے۔ چونکہ رزق کے لئے حیلہ اور موت کیلئے بہانہ چاہئے۔ اس لئے گھر کے پرانے سامان کے ساتھ جنت بھی بازار میں برائے فروخت لے آتے ہیں۔ لیکن اب یہ دور بھی ختم ہو رہا ہے۔ کیونکہ الیکشن مذہب کی جگہ لے چکا ہے۔ سرمایہ دار اپنا روپیہ اور وکیل اپنی دلیل لیکر ووٹ کا شکار کرنے نکلے ہیں۔ اس لئے مولوی صاحب بھی، اپنا پرانا جال لیکر ان شکاریوں کے شریک کار بن گئے ہیں۔ چونکہ سیاست میں ووٹوں کی تقسیم ایک اٹل اصول ہے، اس لئے وقتی ہنگامے بھی ضروری ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ جامع مسجد میں نماز جمعہ کا انتظام بھی حکومت کو پولیس کی نگرانی میں دینا پڑا ہے۔ تاکہ مسلمانوں میں نقضِ امن کا تدارک ہو جائے۔ لیکن اس کے سد باب کی ایک ہی صورت ہے کہ وکیلوں کی پارٹی پر ٹیکس باندھ دیا جائے، سرمایہ داروں کا روپیہ مولویوں میں تقسیم کر دیا جائے، اور قصائیوں کو فوج میں بھرتی کر لیا جائے۔

ہمارے شہر میں ڈسٹرکٹ بورڈ کے الیکشن کا ہنگامہ تھا۔ مسلمانوں کی ایک پارٹی وکیلوں کی سیاست کے خلاف تھی اس لئے ووٹروں کا ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا گیا تھا۔ تاکہ دونوں طرف کے دلائل سننے کے بعد وہ خود اپنی قسمت کا فیصلہ کر سکیں۔ ووٹوں کا حق کھوٹے سکوں کا تحفہ ہے۔ کہ انہیں چلا تو سکتے ہیں لیکن بازار سے جنس نہیں خرید سکتے، یہی وجہ تھی کہ ادھر دھواں دھار تقریریں ہو رہی تھیں، اور ادھر حاضرینِ جلسہ میں کچھ تو ربیع اور حنیف کا حساب لگا رہے تھے، کچھ بیڑی نہ ملنے پر پریشان ہو رہے تھے، اور کچھ لوگ دن بھر کی تکان کے بعد اونگھ رہے تھے۔

ایک کونے میں سب سے دور ایک مولوی صاحب میرے قریب بیٹھے ہوئے مجھ کو عذابِ الٰہی سے ڈرا رہے تھے۔ اُن کو کسی طرح سے پتہ چل گیا تھا۔ کہ میرا اس سیاسی جلسہ سے اتنا تعلق ضرور تھا۔ کہ میں نے مقررین کے دعوتی رقعوں پر پتے اور نام لکھے تھے۔ دراصل یہ ہمارے شہر میں مولوی "گول گنبد" صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ کیونکہ موٹے بھی تھے، اور بولتے بھی رہتے تھے۔ وہ اتنے کالے تھے کہ بلا مبالغہ یہ پتہ چلانا دشوار تھا، کہ اُن کی پیشانی کہاں ختم ہوئی ہے۔ اور سر کے بال کہاں سے شروع ہوئے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کے سامنے کسی امن پسند مولوی کا چراغ مشکل ہی سے جلتا تھا۔ اُن کا تقدس اُن کے علم اور شخصیت سے زیادہ اُن کے نسب کا مرہونِ منت تھا۔ کیونکہ وہ خود اپنی سیادت اور خدا کی وحدانیت پر یکساں اعتقاد رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی، کہ جہاں اُن کی دلیل نہیں چلتی تھی، وہاں اُن کی سیادت کارگر ہو جاتی تھی۔ یہ تو سب جانتے تھے، کہ کالا سید اور گورا چمار نجیب الطرفین نہیں ہو سکتا۔ لیکن چونکہ اُن کی اُمت میں [illegible] بہتر وروں کی کثرت تھی۔ اس لئے کسی کو زبان ہلانے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔

مولانا جیسی ہستی کو ایسے اہم اجلاس میں سب سے الگ تھلگ، دیکھ کر مجھے بہت تعجب ہوا۔ لیکن میں نے اندازہ کیا۔ کہ ان کا یہ طرزِ عمل دو باتوں سے خالی نہیں ہو سکتا۔ یا تو مولانا کو اپنے امیدوار کی کامیابی کا حتمی یقین تھا ۔۔ یا دوسرے امیدوار کی کامیابی کا۔ بہرحال وہ اپنے خالی وقت کا کوئی مصرف چاہتے تھے۔ اس لئے مجھ کمزور پر طبع آزمائی فرمانے لگے۔

انہوں نے گفتگو کا آغاز اس طرح کیا:۔

"کیوں جناب! آپ کو مجھے چٹھی لکھتے ہوئے خدا کا خوف نہ آیا؟"

میں کانپ گیا۔ کیونکہ ایک نیا وکیل ہونے کے لحاظ سے میں اُن کا احترام کرنے پر مجبور تھا۔

"مولانا!" میں نے عاجزی سے کہا۔ "خدا شاہد ہے میری جان اور مال آپ کے اوپر سے، میں اس سے زیادہ اور کیا عرض کروں کہ خدا کرے آپ کو چٹھی لکھنے والے کی ماں غم میں بیٹھ کر روئے۔"

"تحقیق کہ آپ نے مجھے سیدی لکھا اور صاحبِ غیاث اللغات نے اُس سے اہلِ حبش ہی مراد لی ہے۔"

"اوہ! اب مجھے خیال آیا ۔۔! میں نے آپ کو "سیّدی" لکھا تھا۔"

"خیر! الاعمال بالنیات لیکن احتیاطاً آپ تشدید بھی استعمال کر سکتے تھے۔"

"معاف فرمائیے! اُردو تشدید اور اعراب کا لحاظ بچے ہی رکھ سکتے ہیں۔"

"میں مومن کی طرف سے شک نہیں کرتا۔ کیونکہ اللہ ہی عالم الغیب ہے لیکن اب میرا قلب صاف ہو چکا ہے۔"

اس جھڑپ کے بعد مولانا نے اپنی تحقیقات کے دفتر کھولنا شروع کئے۔ فرمانے لگے۔

"میرے مورثِ اعلیٰ سندھ میں سیادت کے باوا آدم کی سی حیثیت رکھتے تھے۔ اور عالمِ اسلام میں پہلے شخص تھے، جنہوں نے ایک ایسی حکمی تجویز پیش کی تھی، کہ اگر اس پر عمل کیا جاتا، تو تمام ہندوستان بیک وقت مسلمان ہو جاتا۔"

"یعنی؟"

"اور آج اقلیت اور اکثریت کا سوال ہی سرے سے نہ پیدا ہوتا۔"

"وہ تجویز؟"

"یہ تھی، کہ ہندوستان میں ہتھنی فوجیں بھیجی جائیں،"

جو بمبئی، کراچی، کلکتہ اور مدراس کی بندرگاہوں پر ستیہ گرہ کریں کہ جب تک تمام ہندوستان اسلام قبول نہ کر لیگا ہم بحری تجارت بند کر دیں گے۔"

"آجکل کا جغرافیہ بتاتا ہے، کہ اُس زمانے میں ان بندرگاہوں کا وجود ہی نہ تھا۔"

اسے مولانا نے سنا نہیں۔

"مجھے یقین ہے، کہ اس زمانے کے ہندو اہنسا کا جواب اہنسا ہی سے دیتے۔"

"شکر ہے۔ کہ اہنسا کا فلسفہ بھی ہماری ہی ایجاد ثابت ہو گیا۔"

"ہندوستان میں اس کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہ تھا چنانچہ تاریخ شاہد ہے، کہ یہاں نہتوں نے اسلام کی خدمت کی۔ اور ہتھیار بندوں نے اس کی بیخ کنی۔ اسی وجہ سے گنگ جمن کے شاہی صوبے میں چودہ فیصدی مسلمان ہیں۔ اور بنگال میں چھپن فی صدی۔"

"اور سندھ میں اسی فیصدی۔"

"اس خطہ پر خدا کی خاص رحمت تھی، یہاں تک، کہ راجہ داہر کی بہن بھی مسلمان ہونیوالی تھی۔"

"وہ! جس نے اپنے حقیقی بھائی سے شادی کی تھی"

مولانا ذرا چونک پڑے، اور کھانس کر کہنے لگے "یہ تقدیری واقعات ہیں۔ قدرت تھا اور مدی تو دیکھئے۔ کہ وہ عاشق ہوتی ہے میرے مورثِ اعلیٰ پر، جو اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے وہ ذکی الحس کمزور، اور نازک بدن کب اس بے رخی کو برداشت کر سکتی تھی، لہٰذا اُس نے انکو زہر دلوا دیا۔"

"اِنّا لِلّٰہ ــــــ!"

"اللہ کے کرم سے یہ صحیح سلامت رہے۔ لیکن ان کا تمام حسن و جمال ہمیشہ کیلئے رخصت ہو گیا۔ یہاں تک کہ آپ کو یہ سُنکر تعجب ہو گا، کہ اُن کے اخلاف میں آجتک سید سانولے رنگ کے اور سیدانیاں گورے رنگ کی پیدا ہوتی ہیں۔"

"مگر آپ کے مورثِ اعلیٰ نے اتنا تکلف کیوں کیا؟"

"اس لئے کہ اُن کی چار ازواجِ مطہرات پہلے سے موجود تھیں۔"

"تو ایک کو طلاق دیدیتے۔"

"وہ ہاشمی تھے، نسب کی پاکیزگی پر فخر تھا۔ اور نسل کی برتری کا خیال، چنانچہ آج تک بفضلِ الٰہی ہمارا قبیلہ اپنی نجابت اور شرافت کے لحاظ سے ممتاز گنا جاتا ہے۔ ایسی ہی ہستیوں کے متعلق کسی شاعر نے کہا ہے۔ (جوش میں آکر) ؎

نظر کی برچھیاں جو سہہ سکے سینہ اسی کا ہے
ہمارا آپ کا جینا نہیں، جینا اُسی کا ہے

وکیل صاحب ذرا نظر پر نظر رکھئے۔

"جی ہاں! آنکھ ہے، آنکھیں لڑی ہوئی ہیں ۔۔۔ اور سینہ سامنے ہے۔"

"معاف فرمائیے! یہ مجاز نہیں ہے حقیقت کی کٹھن منزل ہے۔ ہم جیسے صوفی کو ساتھ لیجئے تو بیڑا پار ہو گا تحقیق کہ علوم انسانی کے دو سرچشمے ہیں۔ اولاً نظر و ثانیاً خبر۔ نظری علوم سے وہ علوم مراد ہیں۔ کہ جو حواسِ خمسہ کے ذریعہ محسوس کئے جاتے ہیں اور خبری علوم سے وہ علوم جو کشفِ باطنی و صفائے روحانی سے حاصل ہوتے ہیں۔ یہاں نظر سے شاعر حقیقت کا متلاشی ما فی الضمیر وہ مادی اشیاء ہیں۔ کہ جو اس عالم رنگ و بو میں موجود فی الخارج ہیں۔"

"بس یہی نکتہ تھا اِس شعر میں" میں نے تفسیر کی قلابازی سے پریشان ہو کر کہا۔

"انگریزی دان اِس کی قدر کیا جانیں۔ آپ لاکھ سائنس پڑھیں۔ لیکن حقیقت کے چہرے سے نقاب نہیں ہٹا سکتے۔ خبر کو ہمیشہ نظر پر فوقیت ہی رہیگی۔"

"شائد آپ کا مطلب یہ ہے۔ کہ طبیعات سے تراز و کیمیا سے امتحانی نلی اور حیاتیات سے خورد بین چھین کر سائنس کی آنکھیں پھوڑ ڈالی جائیں، تاکہ وہ پھر آپ کی کنیز بن جائے۔"

"وہ ہمیشہ سے آپ کی لونڈی رہی ہے۔"

"کیونکہ اس نے آپ کا حکم کبھی مانا ہی نہیں۔"

"وہ خود اندھی ہے۔"

"کیونکہ آپ کی طرح نہیں دیکھتی۔"

"لَاحَولَ اللّٰہ! ہم وہ دیکھ چکے ہیں۔ کہ جسے وہ کبھی نہ دیکھ سکے گی۔"

"سوئے مادر آکہ تیمارت کنم! جس مسئلہ کو ہمارے ادنیٰ سے ادنیٰ فلسفی محض تخیلات کی مدد سے نکال ڈالتے ہیں، اُسے بڑے سے بڑا سائینسدان بھی باوجود اتنی سہولتوں کے حل نہیں کر سکتا۔"

"شائد ان دو ماں بیٹوں کی طرح جو خود کو معلوں ۔۔۔ ظاہر کرتے تھے۔ کہ پانی برسنے کے متعلق کبھی ایک کی پیشین گوئی صحیح ہو جاتی تھی، اور کبھی دوسرے کی ۔۔۔!"

"اور اگر میں امریکہ کے ایک بہت بڑے سائینسدان کی شہادت پیش کروں تب تو مانئے گا؟"

"یقیناً! اور میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں۔ کہ میں اُس کا نام اور پتہ بھی نہیں پوچھوں گا۔"

"حکیم بوعلی سینا جذام کے مریض کے متعلق لکھتا ہے کہ اس سے اس طرح ڈرو، جیسے شیر سے ڈرتے ہو۔"

"یقیناً بہت بلند پایہ تحقیق ہے۔"

"ذرا شیر کے لفظ پر غور فرمائیے؟"

"کیا اچھوتا استعارہ ہے۔ واللہ۔"

یہی مفہوم اس طرح بھی ادا ہو سکتا تھا، کہ شیر کے بجائے کسی اور خطرناک جانور مثلاً چیتے، سانپ، بچھو کا نام لے دیا جاتا۔ لیکن شیر کا نام خصوصیت سے لیا گیا ہے۔ اس لئے امکان اغلب ہے۔ کہ اس سے مجھ ۔۔۔ یہی مشتبہ مراد ہو گی۔"

"جیسے امریکہ کے سائنس دانوں نے آج دریافت کیا ہے۔"

"جی ہاں! کہ جذام کے جراثیم ہوتے ہیں، اور ان کی شکل بالکل شیر جیسی ہوتی ہے۔ اب فرمائیے، کیا یہ اعجاز نہیں ہے؟"

"حکیم بوعلی سینا کا نہیں۔ بلکہ آپ کا معلوم ہوتا ہے۔"

"خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ .... ــــ!"

"مذہب اور سائنس ہمیشہ آپ کے تابع فرمان رہیں گے جب تک کہ آپ کی مٹھی میں اعجاز کا متوکل ہے۔ اور اعجاز کو ہرگز آپ کو تنہا نہ چھوڑے گا۔ جب تک کہ آپ کے پاس تاویل کا طلسم ہے۔ بھوکے کے سامنے خالی دسترخوان پر خیالی کھانا چننے کے بعد، زبردستی پانی پلانا اور بخوشی دعوت کا شکریہ وصول کر لینا، یقیناً آپ ہی کا اعجاز ہے۔"

شاید ۔۔۔ بحث ۔۔۔ جبھی تو اکیلا بیٹھا ہوا تقریر کر رہا تھا۔ کیونکہ مولانا پلیٹ فارم پر تشریف لے جا چکے تھے۔ اور الیکشن کے ڈرامے کا دوسرا سین شروع ہو گیا تھا۔

پہلے مولانا نے خرابیدہ ۔۔۔ مسیلمۃ الکذاب ۔۔۔ زبردستی وصول کیا پھر دو ۔۔۔ دے کر تلاوت کلام پاک کی برکت ۔۔۔ اپنی ۔۔۔ تمام لوگوں کو پوری طرح بیدار کر دیا۔ سب ۔۔۔ لگ گئے ۔۔۔ طرف زندگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنا تعارف اس طرح کیا:۔

"برادرانِ ایمانی!

تمہارے سامنے ایک سیدِ آلِ رسول، پابند صوم و صلوٰۃ حافظِ قرآن۔ پیروِ سنتِ نبوی و شرعِ محمدی، خادمِ ملت و الدین حاضر ہے۔ ...."

لوگ پلیٹ فارم کی طرف کھسکنے لگے۔

۔۔۔ نشانی یادِ ت ۔۔۔ نوں پر پریشان کاکلیں روایت ہنوز ۔۔۔ چہرے پر ایک مٹھی اور چار انگشت ڈاڑھی، سنتِ نبوی۔ ماتھے پر سجدہ لمبے دراز کئے گئے، اور گھٹنوں پر رکوع و سجود کے نشانات، عبا و قبا در بر، جوشِ اسلامی و خلوصِ ایمانی در دل!"

لوگ اکڑوں بیٹھ گئے۔ اور کان کھڑے کر کے سُننے لگے۔

"میں تبلیغ ابن التبلیغ۔ میری پیدائش تسبیح و درود اور حمد و نعت کی فضا میں، زندگی عبادتِ کردگار اور خدمتِ خلق اللہ میں، اور موت مجاہدانہ شوق والہانہ عقیدت، اور عشقِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ...."

مخالف پ۔ ٹی کے لوگ جیبوں سے رومال نکال نکال کر پسینہ پونچھنے لگے۔

"اَیُّهَا النَّاس!

میں مولودِ اسلامی کے کان میں اذان دیتا ہوں۔ بچوں کو کلام ربانی کی تعلیم دیتا ہوں، جو میں ۔۔۔ میں

(باقی بر صفحہ ۱۵، کالم ۳)

مزاحیہ

قبلہ

(از: شیخ ضیاء الدین فضل الدین نوروزجی واڈیا کالج - پونہ!)

ہمارے قبلہ بزرگ خدا انہیں سو سال کی عمر دے۔ ابھی تقریباً ستر سال کے ہیں۔ خدا نے عقل دی تو بچے کی طرح، جوانی میں جمعدار تھے۔ بچے سے جوان اور جوان سے بوڑھے ہوئے۔ ہندوستان حاکم سے غلام ہو گیا، مگر وہ بچے سے جوان نہ ہوئے۔

موصوف کی عادت سی ہو گئی ہے۔ کہ صبح اٹھتے ہی اخبار، جو کہ اخبار فروش چھوڑ جاتا ہے۔ اپنی بڑی اونچی اور تھرتھراتی ہوئی آواز میں پڑھنے لگتے ہیں۔ بس ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے خان صاحب لاہور اسٹیشن سے دنیا کی خبریں براڈکاسٹ کر رہے ہیں۔

پرسوں اتوار کا دن تھا، معمول کے مطابق ہمارے بڑے میاں صبح اٹھتے ہی آنکھیں ملنے کے بعد اخبار لیکر اپنی پرانی ڈھنگ سے خبریں پڑھنے لگے۔

جرمن نے . . . . چرچل نے اپنی تقریر . . . . اسٹیلن کی فوج . . . .

اور نہ جانے کیا کیا خبریں ہونگی۔ دوسرے دن میرا امتحان تھا۔ اس تقریر سے بچنے کے لئے اپنے کمرے میں داخل ہو۔ دروازہ بند کر کے، اردو کی کتاب پڑھ رہا تھا۔ نصیب تو دیکھئے، میرے کمرے میں ایک کھڑکی لگی ہوئی ہے۔ اس میں سے بڑے میاں کی ہوا میں لہریں آکر میرے کانوں کے پردوں سے ٹکرانے لگیں۔ مگر پھر بھی آواز کم تھی۔

پونہ ۔۔۔ آج اتوار بتاریخ ۔۔۔ کو ایرو ڈرے کے میدان میں چینی لوگوں کی نمائش ٹھیک تین بجے شروع ہوگی۔ داخلہ بغیر ٹکٹ ہوگا۔

اس کے بعد ایک دم دھماکے کی آواز آئی۔ میں سمجھا شائد جرمن کا بم نہ گر گیا ہو۔ ٹیبل سے اٹھکر باہر نکل ہی رہا تھا، کہ کھی کھی کھی . . . . کی آواز سنائی دی۔ قبلہ نمائش کا نام سنکر شائد بہت خوش ہو گئے ہونگے، آہا ہا ہا چینیوں کی نمائش ضرور دیکھیں گے۔

"دیکھو! کوئی سن رہا ہے؟ آج تین بجے چینیوں کی نمائش ہے چلوگے نا؟ ضرور چلنا ہوگا۔ آخر ایسا موقعہ آئے گا کب؟ ستر برس کی عمر میں یہ پہلا موقعہ ہے۔"

قبلہ ہر ایک کو نمائش کے لئے مجبور کر رہے تھے۔ مجبور کیوں نہ کرتے۔ آخر جب سب گھر کے ممبر چلیں گے، تب ہی انہیں دیکھنے کو ملیگا۔ ہر ایک سے چینیوں کی بہادری سناتے ۔۔۔ بڑے میاں خوش بہت تھے۔ خوش کیوں نہ ہوتے۔ آخر مفت تھا، اگر وہ شو ٹکٹ سے ہوتا، تو چینیوں کو کوس کوس کر انگلیاں توڑ دیتے کیونکہ ان کی ایک عادت سی ہو گئی ہے۔ کہ جب بھی آپ کسی پر خفا ہوتے ہیں۔ تو اپنا غصہ کوس کوس کر کم کرتے ہیں۔

"بیٹا! بیٹا دروازہ کھولو!" میرا دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے بڑے میاں نے کہا۔

"کیا ہے قبلہ!" میں نے دروازہ کھولتے ہی پوچھا۔

"بیٹا! دیکھو آج نمائش دیکھنے چلنا ہے۔ تین بجے چلوگے نا!"

"نہیں۔"

"واہ! کیوں نہیں؟" قبلہ بزرگ نے سر کو ترچھا کرتے ہوئے پوچھا۔

"میرا کل امتحان ہے۔"

"امتحان آخر ٹرمینل تو ہے۔"

"ٹرمینل؟" میں نے ہنسی کو روکتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں جو کچھ بھی ۔۔۔ ٹرمنل تو ہے۔"

"مگر پروفیسر صاحب کیا کہیں گے، اگر میں فیل ہو گیا تو؟"

"کہیں گے کیا؟ میں ان کے نام ایک چٹھی لکھ دوں گا کہ میرا بیٹا نمائش دیکھنے گیا تھا۔ اس لئے پڑھ نہیں سکا۔ پاس کر دیجئے۔"

مجھے یکلخت ہنسی آئی۔ شائد انہوں نے آجکل کے کالج کو اپنے زمانے کا پاٹ شالہ سمجھ رکھا تھا۔ میں نے ہنسی کو روکنے کے لئے ہاں کہہ دیا۔

الغرض بڑے میاں نے غلاموں کو راضی کر لیا۔

نمائش تین بجے تھی۔ اور شائد اس وقت صبح کے آٹھ بج گئے ہونگے۔ قبلہ کو ابھی پانچ چھ گھنٹے گزارنے تھے، وقت کٹتا کیسے؟

بڑے میاں گھر میں گھومنے لگے۔ کچھ دل کو سکون حاصل نہ ہوا۔ چلا چلا کر کہنا شروع کیا۔

"ارے بشیر! او بشیر! کہاں گئے ہو۔ کپڑے بدلو! کیوں نمائش کو نہیں چلوگے؟ ہاں، ذرا اچھے کپڑے پہن آ! وہ نئی شیروانی جو عید کو سلائی ہے۔ . . . . . ہاں، ہاں، وہی سفید۔ اسے پہنو! بالکل نواب دکھائی دوگے۔ لوگ کہیں گے، جمعدار کا بیٹا نوجمعدار معلوم ہوتا ہے۔ جلدی کرو۔"

"ارے او نجمو! بال تو سنوارو ارے توبہ، توبہ کیسی گندی لڑکی دکھائی دیتی ہو۔"

"قمرن! دیکھو تو، تم کیسی کالی معلوم ہوتی ہو، ذرا صابن لگا کر ہاتھ پاؤں دھوؤ۔ ہاں! اور ذرا پاؤڈر بھی لگانا لوگ کیا کہیں گے، جمعدار ۔۔۔ پنشنر کے بچے کالے، توبہ توبہ ۔۔۔ کالے!"

بڑے میاں ایک درجن بچوں کے نام الگ الگ پکار کے انہیں ہدایتیں کر رہے تھے۔ کسی کو نواب بننے کو کہہ رہے تھے۔ کسی کو گورا بنانے کی کوشش کر رہے تھے کسی کو انگریز اور کسی کو میڈم۔ حتیٰ کہ ان کی ہدایتیں ختم ہو گئیں، اب "قبلی" کی باری تھی۔ قبلی باورچی خانے میں چولھے کے سامنے تنور کی روٹی بنی ہوئی تھیں۔ تمام جسم پسینہ پسینہ ہو گیا تھا۔ قبلہ نے چلا کر کہا۔ "ارے بی انجمن کی ماں! کہاں گئی ہو؟ سنو تو، کیا نمائش کو نہیں چلنا ہے؟ ذرا . . . ."

قبلی کا درجۂ حرارت پانی کے بوائلنگ پوائنٹ سے بڑھ گیا۔ جھنجھلا کر بولیں۔

"کیا بڑھاپے میں عقل ماری گئی ہے۔ ابھی تو نو بجے ہیں۔ کیا نمائش کا جا کر میدان میں جھاڑو دینا ہے؟"

اتنا کہنا تھا، کہ قبلہ منہ پھلائے ایک کونے میں جا بیٹھے گھر میں خاموشی چھا گئی، جیسے کسی نے ریڈیو کا بٹن بند کر دیا ہو۔ جوں توں کر کے انہوں نے چار گھنٹے گزارے۔

سبھی نے نئے لباس پہن رکھے تھے۔ قبلہ نے پرانے جمعداری کا لباس پہن لیا۔ اپنے آپ کو آئینہ میں دیکھا۔ لباس پر سفید لمبی ڈاڑھی بری معلوم ہوئی۔ مجھ سے ملتجی لہجہ میں کہا۔ منیر! کیا تم بتاؤ گے؟ کہ خضاب کا پرانا ڈبہ کدھر ہے؟ بڑے میاں نے دو تین سال سے خضاب لگانا چھوڑ دیا تھا۔ مگر معلوم نہیں آج شائد لباس کو دیکھکر جوانی یاد آگئی ہو، خضاب کا ڈبہ مل نہیں رہا تھا۔ بڑے میاں ہر ایک کو پوچھنے لگے۔ اور ہر ایک کو ڈبہ تلاش کرنے کو کہتے۔ گھر میں دھوم مچی تھی۔ بہرحال اللہ اللہ کر کے ڈبے نے بڑے میاں کے بڑھاپے پر رحم کھایا، اور خود کو نمودار کیا۔

قبلہ نے ڈبہ کھولا! بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھا۔ تو اس میں خضاب موجود تھا۔ مگر یہ نہیں سوچا، کہ اتنا خضاب دس انچ لمبی ڈاڑھی کو کافی بھی ہوگا، کہ نہیں، بس خضاب ڈاڑھی پر ملنے لگے۔ جب خضاب ختم ہوا، تو آئینہ دیکھا۔ کیا دیکھتے ہیں، کہ خضاب نے صرف آدھی ڈاڑھی کو رنگا ہے، بچوں نے جب والد بزرگ کی صورت دیکھی، تو ہنسنے لگے، قبلہ کو غصہ بہت آیا، چلا کر کہا:۔

"ہنستے کیا ہو!"

قبلی نے جلتی پر تیل ڈالا۔ "ہنسیں نہیں تو اور کیا۔۔ تمہیں جو بڑھاپے میں جوان ہونے کی سوجھی ہے۔"

"بڑھاپے میں جوان ہونے کی سوجھی ہے۔" بڑے میاں نے والدہ کے الفاظ کو منہ بگاڑ کر دہرایا۔

بشیر نے کہا۔ "قبلہ! ڈاڑھی منڈا دو بس!"

اس کی تمام ممبروں نے تائید کی۔ قبلہ سوچ میں پڑ گئے۔

"میری ستر برس کی ڈاڑھی آج مجھ سے جدا ہو جائیگی، اسے کیسے احتیاط سے رکھا تھا۔"

پھر میرا شیونگ سٹ منگا ڈاڑھی بنانے والے تھے، کہ نجمن نے کہا:۔

"آپ اسے سیاہی سے رنگ کیوں نہیں لیتے؟"

"واہ خوب! بڑے میاں نے کہا۔ "کیا اچھی رائے دی ہے بیٹیا۔ ذرا سیاہی لے تو آ!"

فوراً روشنائی منگائی گئی۔ قبلہ نے اپنی ڈاڑھی کو اچھی طرح رنگا۔ اور نوجوانوں کی طرح اکڑنے لگے۔ پھر گھڑی کی طرف دیکھا، دو بج رہے تھے۔

"ارے اتنی دیر کیسے ہوئی، تم لوگ کیا کر رہے تھے؟"

بدرلن نے کہا:۔

"آپ کی ڈاڑھی جو رنگ رہی تھی۔"

"خیر! جلدی کرو۔ ارے قمرن! جلدی کرو گی بھی یا نہیں۔ نمائش دیکھنی نہیں ملے گی۔ ایسا وقت پھر کب آئیگا؟"

سبھوں کو جو نظر آئے، انہیں باہر کیا۔ دروازے کو قفل لگا، ایدڈا جلنے والی فوج کے سردار بن کر آگے آگے چلنے لگے۔

ایروڈرے کے میدان میں اچھا خاصہ میلہ لگا ہوا تھا۔ تمام قسم کے لوگ چینیوں کی جسمانی ورزشیں اور کمالات دیکھنے آئے تھے۔ اچھا خاصہ ہجوم تھا۔ ہمارے قبلہ نے ہمیں ایک اچھی جگہ جا بٹھایا۔ اور خود بھی وہیں بیٹھ گئے۔ ٹھیک تین بجے چینی لوگ میدان میں آئے۔ اور اپنے کمالات دکھانے شروع کئے۔ پہلے تو نوجوانوں نے اپنے کرتب دکھائے۔ پھر لڑکوں نے، پھر بچوں نے۔ بچوں کی صف میں ایک بچی بہت خوبصورت تھی۔ وہ قبلہ کو بہت بھائی۔ کہنے لگے:۔

"اے بی! او نجمن کی ماں! اگر اپنی بے بی کو پاؤڈر، واؤڈر ملا جائے، تو بالکل اس بچے کی طرح ہوگی۔ بس بے بی ایسی ہی ہے۔ میری بے بی بڑی اچھی ہے۔ ارے بے بی کو میرے پاس دو، میں اُسے پیار کر لوں۔ مجھے بہت بھاتی ہے، جی چاہتا ہے سینے سے الگ نہ کروں۔"

والدہ نے کہا! "میرے پاس کہاں ہے! میں تو سمجھی آپ ہی کے پاس ہے۔"

"اور میں سمجھا، تمہارے پاس! ارے او منیر! بے بی کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"مجھے نہیں معلوم!" قبلہ نے منہ بگاڑ کر لفظ دہرائے، "ارے بشیر! بے بی کہاں ہے؟"

"میں کیا جانوں۔"

"میں کیا جانوں!" قبلہ نے گردن ترچھی کر کے کہا۔ "ارے او قمرن! بے بی کہاں ہے؟"

"اللہ جانے!"

"اللہ جانے!" قبلہ نے لفظ دہرائے۔ "مگر تو کیا جانتی ہے؟"

"کچھ نہیں۔"

"کچھ نہیں" منہ بگاڑ کر کہا۔

پھر کیا تھا! والدہ گھبرا گئیں۔ رونے لگیں، ایک کہرام مچ گیا۔ لوگوں کی نظریں بجائے چینیوں پر جمنے کے ہم پر پڑنے لگیں۔

جب سب جواب دے چکے، تو بڑے میاں خاموش بیٹھے چینیوں کے کرتب دیکھنے لگے ——— والدہ نے کہا:۔

"ارے خاموش کیا بیٹھے ہو، کہیں تلاش کرو۔"

بڑے میاں کا مزاج بگڑ گیا۔ کہنے لگے:۔

"تلاش کیا کروں، اور کہاں کروں۔ یہ نمائش جو ہے ایسا وقت زندگی بھر نہیں آئیگا۔"

قبلی نے رو کر کہا۔

"تو تمہیں بچے سے نمائش زیادہ پسند ہے۔ میں خود کہیں جا کر ڈھونڈ لاتی ہوں۔"

اتنا کہہ کر والدہ وہاں سے اُٹھیں، مرغی کے پیچھے مرغی کے بچے بھی چلنے لگے۔ مگر مرغے میاں اپنی جگہ پر سے ہلے تک نہیں۔ جب اُنہیں یقین ہو گیا، کہ اب یہ لوگ نمائش نہیں دیکھینگے تو خود بخود اُٹھے، اور ہمارے پیچھے دوڑتے ہوئے آ کر کہا۔

"تمہیں معلوم نہیں بے بی کہاں کھو گئی۔ پورے ایک درجن ہو، ایک کو بھی نہیں معلوم، کہ بے بی کدھر چلی گئی؟"

"اگر ہمیں معلوم ہوتا، کہ بے بی کدھر چلی گئی ہے۔ تو ہم اُسے لے نہ آتے۔ یا جانے ہی کیوں دیتے۔"

تم کسی کام کے نہیں، نمائش کا مزہ بگاڑ دیا۔ ایسی نمائش پھر سے تھوڑی ہی آئے گی۔ تم بڑے خراب ہو۔"

"اچھا خراب ہی سہی۔ مگر میرا بچہ!" اتنا کہہ کر والدہ زور زور سے رونے لگیں۔

"ارے روتی کیوں ہے۔ لوگ کیا کہیں گے، جمعدار پنشنر کی ...."

میں نے کہا:۔

"ابا! پولیس میں رپورٹ کیوں نہیں دیدیتے۔"

"ہاں، تو ٹھیک کہتا ہے۔ چلو سامنے والی چوکی پر رپورٹ لکھوائیں۔"

بڑے میاں نے اپنی پوشاک درست کی اور چھڑی گھماتے ہوئے پولیس میں رپورٹ لکھانے چلے ——— پولیس میں جا کر کہا:

"دیکھو، ان کا بچہ کھو گیا ہے۔"

"کن کا بچہ؟" پولیس نے پوچھا۔

"ان کا" ہماری طرف اشارہ کیا۔ "یعنی میرا بچہ نہیں، نہیں بچی کھو گئی ہے۔"

"کب؟"

"ابھی نمائش گاہ میں۔"

"عمر کیا ہے؟"

"اے بی، (قمرن کی اماں) بے بی کی عمر کیا تھی؟"

"کیا تم نہیں جانتے؟ ابھی رمضان، ایک رمضان وو...... دو، بندہ نواز بکترید (بقرعید) بس دو برس تین مہینے کی ہے میری منی۔" والدہ نے انگلیوں پر گن کر بتایا۔

"ہاں بھیا! سوا دو سال کی ہے۔" بڑے میاں نے پولیس سے کہا۔

"نام کیا ہے؟"

"نام وام تو ابھی کچھ بھی نہیں رکھا، بس بے بی ہی پکارا کرتے ہیں۔"

"رنگ؟"

اب قبلہ سوچ میں پڑ گئے۔ اگر کالا لکھاتا ہوں تو پولیس والے اور آفیسر کیا کہیں گے، جمعدار ——— پنشنر کی بچی کالی پھر سوچا، کہ سچ سچ کہنا چاہیئے۔ بے بی کو تلاش کرتا ہے۔ پھر عزت کا بھی خیال ہے۔

"بھیا گورا لکھو!"

"گورا نہیں۔ میری بچی کالی ہے۔" قبلی نے کہا ——!

"ارے ہاں، بھول گیا تھا، بالکل صحیح، رنگ کالا ہے۔"

"لباس کیسا تھا؟" پولیس نے پوچھا۔

"لباس مجھے نہیں معلوم۔ اے بی! او نجمن کی اماں! نکلتے وقت بے بی کو کونسا لباس پہنایا تھا؟"

"میں نے اُسے کپڑے نہیں پہنائے تھے۔"

"نجمن! بے بی کا لباس کیسا تھا؟

مجھے کیا معلوم! میں نے اُسے کپڑے تھوڑے ہی پہنائے تھے۔"

قبلہ ہر ایک سے سوال کرتے، اور اُنہیں معلوم نہیں جواب ملتا۔ آخر میں بگڑ کر کہنے لگے:۔

"تو کیا بے بی ننگی چلی گئی؟" پھر پولیس سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

"بھئی ہمیں لباس کے متعلق معلوم نہیں۔"

پولیس مین بھی قبلہ کی باتوں پر ہنسنے لگا۔ پتہ لکھنے کے بعد کہا:۔

"اچھا! تم گھر چلے جاؤ، ہم اُس کی تلاش کرتے ہیں۔"

"ہاں، ضرور، مگر ذرا جلدی، دل بیچین ہو رہا ہے، اور چاہتا ہے، کہ جہاں وہ گئی ہے۔ میں بھی وہیں چلا جاؤں"

پھر ہم سے کہا:۔

"چلو کھڑے کیا ہو؟ گھر چلو، کیا سنا نہیں؟ پولیس نے کہا ہے۔ کہ گھر جاؤ۔"

"مگر میری بچی؟" والدہ پھر رونے لگیں۔

"ارے پھر میری بچی ——— پولیس تلاش کر لے گی، ہمیں کیا اس سے، تلاش کرنا اُن کا کام ہے۔ آخر پولیس ہوتی کس لئے ہے؟"

"مگر بچی تو اپنی ہے۔"

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔ مگر گھر چلو وہاں رونا، لیتے

میں لوگ کیا کہیں گے۔ کہ جمعدار ۔۔۔۔۔۔

بہر حال ہم تمام گھر لوٹے۔ جاتے وقت خوش خوش گئے تھے۔ مگر آتے وقت سب ہوں کے منہ لٹکے ہوئے تھے۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ جمعدار ۔۔۔۔ کی فوج کسی مقام کو فتح کرنے گئی تھی۔ مگر شکست کھا کر واپس آ گئی۔

قبلہ نے دروازہ کھولا ہم سب اندر داخل ہوئے قبلی کے دل میں آگ لگی ہوئی تھی۔ سب کو آتے دیکھ کر زور زور سے رونے لگیں۔

"میری بچی! تو کتنی اچھی تھی۔ ہائے میرے اللہ! وہ کہاں ہو گی؟"

رونے کی آواز سنکر اڑوس پڑوس کی عورتیں بھی جمع ہو گئیں۔ ۔۔۔ اور حال پوچھ پوچھ کر ہمدردی ظاہر کرنے کے لئے اماں کے ساتھ مل کر زور زور سے خود بھی چلانے لگیں ۔۔۔ گھر میں ماتم برپا تھا۔ تمام غمگین تھے، عورتیں بے بی کا مرثیہ پڑھ رہی تھیں۔

قبلہ کمرے میں ٹہلتے ٹہلتے کچھ سوچ رہے تھے۔ لڑکی کہاں گئی ہو گی ۔۔۔ کہیں بھاگ گئی ہو۔ لیکن بچی نہیں سکتی آخر پولیس جو تلاش کرے گی ۔۔۔ مگر وہاں ہجوم بہت تھا گاڑی گھوڑا ۔۔۔ کہیں ایسا نہ ہو، کہ موٹر کے نیچے آ جائے ۔۔۔ اتنا سوچنا تھا کہ بہ آواز بلند رونے لگے۔ مگر فوراً یہ دیکھکر کہ گھر میں عورتیں موجود ہیں خیال کیا۔ کہ یہ عورتیں کیا کہیں گی ۔۔۔ جمعدار ۔۔۔ پنشنر اور رو رہے ہیں بس رونا ختم ہو گیا۔

قریب ہی ہماری خالہ جان رہتی تھیں انہیں جو معلوم ہوا، وہ بھی دوڑی دوڑی آئیں۔ انہیں دیکھتے ہی اماں جان دھاڑیں مار مار کر رونے اور زور زور سے چلانے لگیں۔ اِدھر اماں چلا رہی تھیں، اور ادھر سونے کے کمرے سے بے بی کے رونے کی آواز آئی۔

میں دوڑتا ہوا سونے کے کمرے میں گیا۔ بے بی اندر موجود تھی۔

قبلہ نے دیکھا تو چلا کر کہا:-

"تجھے بھی اِسی وقت نیند آتی تھی؟"

قبلی کو معلوم ہوا، تو بھاگی بھاگی آئیں۔ مارے خوشی کے پھولی نہ سماتی تھیں۔ جلدی سے بے بی کو گود میں لے لیا۔ پیار کیا، گلے لگایا۔ اتنے میں سب عورتیں بھی اندر آ گئیں، سب نے دعائیں دیں۔

قبلہ بزرگوار پھر بگڑے، اُن کو فوراً نمائش کا خیال آیا، اور چلانا شروع کیا۔ بے بی پر غصہ آ رہا تھا۔ اُسے مخاطب کرتے ہوئے بولے:-

"اگر سونا تھا، تو کہہ کر سوئی ہوتی۔ کیا تجھے نمائش نہیں دیکھنی تھی۔ سارا لطف جاتا رہا۔ مزہ کرکرا ہو گیا۔ نمائش تھوڑے دوبارہ دیکھنے کو ملے گی۔"

اور کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگے ۔۔۔ پھر بولے۔

"بد تمیز کہیں کے، بزرگوں کا کچھ خیال نہیں۔ نالائق ۔۔۔!"

بقیہ "خوابوں کی دنیا" سلسلہ صفحہ ۲۲

وادی کی گہرائیوں سے موسیقی کی لہریں بلند ہوئیں ایک ایسی موسیقی، کہ جس میں شیریں ترنم کے ساتھ قلب محزون کا کچھ سوز بھی شامل ہوتا ہے۔ اور چونکہ اُسے صرف دل کے کانوں سے سننا ممکن ہے۔ اس لئے مجھے سانس روک لینا پڑا۔ مبادا میری تنفس کی صدائے کرخت سے اس کی پُر درد لطافت زائل ہو جائے۔ میں سنتا رہا، اور دیکھتا رہا حتیٰ کہ ضبط و تحمل کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں نے جسم کی تمام طاقت حلق میں تبدیل کر کے اپنی آواز بلند کی جس سے پہاڑوں کی فلک بوسیاں اور اونچے دامنوں کی اتھاہ گیاں تھرا کر گونج اٹھیں۔ وادی کا نغمہ اور زیادہ تیز ہو گیا

وہ اپنے نازک ہاتھوں کی جنبش سے رخصتی سلام کرتے ہوئے عمیق غار میں اترتی چلی گئی۔ اور میں کھڑا رہا۔ شستدر حیران جامد و ساکت۔

صبح کو بیدار ہوا، تو بیہودہ اس ہولناک خواب کے اجزائے پریشاں کو مجتمع کرنے کی کوشش کی۔ مگر بے سود کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا، کہ اسے خواب کہوں یا حقیقت سے تعبیر کروں، اِس عالم وحشت میں تھا۔ کہ ایک پیغام ملا۔

"کوچ کر گئی وہ گزشتہ رات کی تاریکیوں میں اِس سرائے فانی سے ملکِ عدم کی جانب بکمال صبر و سکون!"

میں نے گلدان میں سے ایک پھول اٹھایا، جو اِس غیر متوقع حادثہ سے متاثر ہو کر کملا چکا تھا۔ اُسے اپنے گرم آنسوؤں سے سینچا۔ اور یہ کہہ کر بھیج دیا۔ کہ سینے پر کفن کے اندر رکھ دیا جائے۔ جب میں وہاں پہنچا۔ تو آخری آرامگاہ کی طرف اُسے لیجا رہے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ اسوقت میری آنکھوں کے آنسو نہیں نکلے۔ ورنہ زندگی کا سب سے بڑا راز لوگوں کو معلوم ہو جاتا۔ اور شائد میری محبوبہ مجھ سے برہم ہو کر میرے خوابوں کی نگری سے بھی کنارہ کش ہو جاتی۔ وہ دنیا کی نگاہوں سے روپوش ہو گئی تھی۔ مگر میرے نہاں خانۂ دل میں بدستور خلوت نشین تھی۔

میں نے اسی رات اُس کو دوبارہ خواب میں دیکھا۔ وہ حسب عادت متبسم تھی، اور میرا بھیجا ہوا پھول اُس کے ہاتھ میں تھا۔

اِس بات کو بہت عرصہ گزر گیا۔ اور اب تک میں اِس تمنا میں زندہ رہا، کہ وہ مجھے اپنے پاس بلا لے، دوسری دنیا میں پہنچنے سے پہلے، یہاں کے بندھن یہیں ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور وہ رکاوٹیں باقی نہیں رہتیں، جن کا خیال کر کے ہم ایک دوسرے سے اجتناب کرتے ہیں۔

عزیز دوست! میری دیرینہ آرزوؤں کا وقت قریب آ گیا ہے۔ آج رات کے آخری پہر میں اِس وادی کے عمیق ترین سایوں میں میرے نام کا باجہ بجے گا۔ وہ وادی کونسی ۔۔۔؟ کیا تم جانتے ہو ۔۔۔؟ دیکھو، وہ یہی ہے۔ ہماری نظر کے سامنے ۔۔۔ یہاں موسیقی کی سوئی ہوئی لہریں ایکبار پھر بیدار ہوں گی۔ اور میں جوشِ مسرت سے بیتاب ہو کر بخوشی موت کے آغوش میں جا گرونگا۔

(ساقی)

شاد کی شاعری کا بقیہ!

حاضر ہے گر پسند ہے کیا دل کا مول ہے؟
قیمت کو پوچھتے ہو تو سونے کی تول ہے

پتھر چٹائے حلق پہ خنجر کو پھیرنا
جلاد کو پڑی ہوئی ایسی کہاں کی تھی

کبھی وہ بے تکلفی سے کوئی متروک لفظ بھی استعمال کر جاتے ہیں۔ مثلاً ؎

پڑکے لحد میں ہاں ولا چین کر اب تو حشر تک
اب کہ جفا کی سختیاں تُونے بہت اُٹھائیاں

"اُٹھائیاں" غالب کے بعد سے متروک چلا آ رہا ہے۔ اور پڑھے لکھے لوگوں کی زبان پر کہیں بھی جاری نہیں! مگر یہ ایسے نقائص ہیں، جو بہتے ہوئے دریا میں ایک تنکے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ورنہ شاد اُردو کے ایک صاحب طرز مشاعر اور اُردو غزل میں ایک خاص رنگ کے موجد ہیں۔ ہم طوالت کے خوف سے اُن کے چند شعر پیش کر کے اس گفتگو کو ختم کرتے ہیں ؎

دل تو بدنام ہے خود شاد محبت اس کا گلا!
کہتے آتی ہے حیا

یہ اُمیدیں، یہ تمنا جنہیں برسوں پالا
یہ کب اپنی ہیں بھلا

رُت پھری ساری ہری ڈالوں میں پھوٹی کونپل
آ گئے پھول اور پھل

اک یہ اُجڑا ہوا دل ہے۔ کہ نہ پھولا نہ پھلا
اور سوکھا ہی کیا

رس بھری ملے وہ آنکھیں تیری کالی کالی
بے پیئے متوالی

سانولا رنگ نمک ریز جراحاتِ جفا،
اُف کہاں دھیان گیا

اِک ایک ستم اور لاکھ ادائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے
ترچھی نگاہیں بند قبائیں اُف ری جوانی، ہائے زمانے

اپنی ادا سے آپ جھجکنا، اپنی ہوا سے آپ کھٹکنا،
چال میں لغزش منہ پہ ہوائیں اف ری جوانی ہائے زمانے

ہاتھ میں آڑی تیغ پکڑنا، تاکہ لگے بھی زخم تو اوچھا!
قصد کہ پھر جی بھر کے ستائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

پچھلے پہر اُٹھ اُٹھ کے نمازیں ناک رگڑنی سجدے پہ سجدے
جو نہیں جائز اُس کی دعائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

(مظفر حسین شمیم)

عندلیب کا مطالعہ

آپ کو

بمبئی بھر کے تمام اُردو اخبارات سے بے نیاز کر دیگا

غدار دوست!

از
امان اللہ خاں
برہانپوری

افراد

کلیم ———— شمیم کا بڑا بھائی
شمیم ———— ایک معزز خاندان کا رکن
شریف ———— شمیم کا لنگوٹیا دوست

زمانہ حال

پہلا منظر

جگہ:- شریف کا کمرہ ———— وقت ۱۲ بجے رات

شریف خواب غفلت میں پڑا ہوا ہے۔ کلیم شریف کے کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ شریف کو جگا کر کہتا ہے۔

کلیم:- (شمیم کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے) یہ خنجر لو اور اپنے دوست کا خاتمہ کر دو۔

شمیم:- معاف کیجئے بھائی جان! یہ تو مجھ سے کبھی نہیں ہو سکتا۔

کلیم:- (غصّے سے) کیا کہا۔ یہ تم سے کبھی نہیں ہو سکتا۔ بزدل کہیں کے، خون کرتے ہوئے ڈرتے ہو۔

شمیم:- یہ بات نہیں ہے بھائی جان، وہ میرا دوست ہے میں نے اس کو دوست کہا ہے۔ ہم نے عہد کیا ہے کہ ہم زندگی کے آخری سانس تک دوستی کو نبھائیں گے۔ پھر آپ ہی بتلائیے میں اپنے دوست کے خون میں اپنے ہاتھ کیسے رنگ سکتا ہوں؟

کلیم:- (بہت غصّے سے) اب تمہیں کہتے ہوئے شرم نہیں آتی تم اس کو دوست کہہ رہے ہو جس نے تمہاری عزت پر ڈاکہ ڈالا جس نے تمہارے خاندان کی ناک نیچی کر دی۔

شمیم:- کچھ بھی ہو بھائی جان۔ میں اپنے دوست پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔

کلیم:- (آپے سے باہر ہوتے ہوئے) تم پیدا ہوتے ہی مر جاتے تو اچھا ہوتا۔ نالائق کہیں کا۔ نکل جا یہاں سے۔ تم جیسے بے شرم، بے حیا کی اس مکان میں رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ چلو۔ چلو۔ جاؤ میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ تم میرے باپ کی اولاد نہیں ہو۔ تم میرے لئے اور میں تمہارے لئے مر چکا ہوں۔

(شمیم خاموشی کے ساتھ چلا جاتا ہے)

دوسرا منظر

شریف کا کمرہ .... وقت صبح

(شریف آرام کرسی پر لیٹا ہوا سگرٹ پی رہا ہے۔ کرسی کے سامنے ایک خوشنما گول میز ہے۔ جس کا میز پوش قدرے میلا ہو گیا ہے۔ اس کے ارد گرد چار پانچ پرانی کرسیاں پڑی ہوئی ہیں۔ میز کے دائیں اور بائیں کناروں پر قرینے سے کتابیں رکھی ہوئی ہیں۔ کتابوں کے درمیان میں الارم گھڑی ہے پاس ہی دوات اور قلم رکھے ہوئے ہیں۔ کمرے کی دیواریں خوبصورت اور حسین تصویروں سے سجی ہوئی ہیں۔ میز کے سامنے والی دیوار پر کیلنڈر لگا ہوا ہے۔ کیلنڈر کے پاس ہی ہندوستان کا نقشہ آویزاں ہے۔ کمرہ کی پچھلی دیوار میں کھڑکیاں ہیں جن کی جالیوں میں سے آفتاب کی روشنی چھن چھن کر آ رہی ہے)

(کوئی دروازے پر دستک دیتا ہے)

شریف:- کون ہے؟

نوکر:- بابوجی میں ہوں آپ کا خادم، شمیم صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

شریف:- (دروازہ کھولتے ہوئے) ان کو یہاں بھیج دو۔

(تھوڑی دیر کے بعد شمیم کمرہ میں داخل ہوتا ہے)

شریف:- (کرسی پر سے اٹھتے ہوئے) آئیے شمیم صاحب! آئیے۔ تشریف رکھیے (ہاتھ ملاتے ہوئے) آپ تو دکھائی ہی نہیں دیتے۔ آپ تو بالکل عید کے چاند ہی ہو گئے۔ بہت دنوں کے بعد صورت دکھائی۔ (کرسی پیش کرتے ہوئے) بیٹھیے (جیب سے سگرٹ کا پاکٹ نکالتے ہوئے) لیجئے سگریٹ پیجئے۔

شمیم:- (نہایت بیدلی سے) معاف فرمائیے میں نے سگرٹ ترک کر دی ہے۔

شریف:- آہا ہا۔ آپ نے سگرٹ چھوڑ دی۔ بہت اچھا کیا۔ یہ بہت بری عادت ہے۔ اور بہت ضرر رساں بھی۔ میں نے بھی بہت کوشش کی لیکن کمبخت چھوٹتی ہی نہیں۔

(شمیم کرسی پر خاموش بیٹھا ہوا شریف کی باتیں سن رہا ہے اس کے چہرہ سے حزن و ملال کے آثار نمایاں ہیں)

شریف:- ہاں بھئی سناؤ کیا حال چال ہیں۔ ارے تم خاموش کیوں بیٹھے ہو۔ کچھ بولتے نہیں۔ کیا بات ہے۔ آج تم بہت پریشان نظر آ رہے ہو۔

شمیم:- (غصّے کو ضبط کرتے ہوئے۔ اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے چباتے ہوئے) یہ مجھ سے پوچھتے ہو۔ پوچھو اپنے دل سے اپنے ضمیر پر ہاتھ رکھ کر کہو کہ تم نے میری دوستی سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ تم نے دوستی کے پردے میں اپنی نفسانی خواہشوں کو پورا نہیں کیا؟

شریف:- (شریف کے چہرہ کا رنگ فق ہو جاتا ہے پھر بھی اپنے گناہ چھپانے کے لئے زوردار لہجہ میں کہتا ہے) کیا کہہ رہے ہو شمیم! نشہ میں تو نہیں ہو کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ کیا فائدہ؟ کیسی خواہش؟ تمہیں ایک دوست پر الزام لگاتے ہوئے شرم نہیں آتی؟

شمیم:- تمہیں شریف شرم آنا چاہئے۔ تم نے ایک دوست کی بیوی پر ہاتھ صاف کیا۔ تم نے دوستی کی قدر نہ جانی۔ تم نے اپنی نفسانی خواہشات پر دوستی جیسی انمول چیز کو قربان کر دیا۔

شریف:- زیادہ بکواس مت کرو۔ زبان بند کرو۔ ورنہ ٹھیک نہ ہوگا۔

شمیم:- (آہ سرد بھرتے ہوئے) اب کیا ٹھیک نہ ہوگا۔ اب بھی کچھ بگاڑنا باقی ہے۔ تم نے میری عزت لوٹ لی۔ لو سب کچھ لوٹ لیا۔ اب میرے پاس کیا رکھا ہے جس پر تم ڈاکہ ڈالو گے۔

شریف:- (ہاتھ ملتے ہوئے) کیا کروں؟ میں نے تمہیں دوست کہا ہے ورنہ تمہیں اس زبان درازی کا مزہ چکھاتا۔

شمیم:- (ایک لمبی سانس لیتے ہوئے) مجھے بھی اس بات کا بہت افسوس ہے۔ کاش! تم میرے دوست نہ ہوتے؟

شریف:- ورنہ کیا ہوتا؟

شمیم:- (رعب دار آواز میں) کیا ہوتا۔ تمہارا ناپاک جسم خاک و خون میں لتھڑا ہوا نظر آتا۔ تمہاری نجس روح جہنم میں پناہ ڈھونڈھتی۔

شریف:- (پستول نکالتے ہوئے) دیکھتا ہوں اب کس کی لاش خون میں تڑپتی ہے۔

(شریف کا فیر کرنا۔ شمیم کا اپنی جگہ سے ہٹ جانا نشانہ کا خالی جانا۔ شمیم کا تیزی سے شریف پر جھپٹ کر ریوالور کا چھین لینا)

شمیم:- (قہقہہ لگاتے ہوئے) آہا، ہا ہا شکار کرنے کو گئے اور خود شکار ہو کر چلے۔

(فیر کی آواز سنکر پولیس کا آ جانا)

شریف:- (شمیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) پکڑو بدمعاش کو یہ مجھکو جان سے مار ڈالنا چاہتا ہے؟

(پولیس کو شمیم کو گرفتار کرنا۔ شمیم کو ہتھکڑی پہنا کر لے جانا۔ شریف کا پولیس والوں کے پیچھے پیچھے خوش خوش جانا۔)

پردہ کا
آہستہ آہستہ
گرنا

اولاد کی محبت

از مس ے الف م

قمر کی پیدائش کے قبل وہ مجھے بیحد چاہتے تھے۔ ہماری شادی کو تین سال ہو رہے تھے کہ خدا نے ہمیں دنیا کی بیش بہا نعمت یعنی اولاد عطا کی۔ اس کی آمد سے پہلے تو یہ بہت خوش تھے۔ کبھی کہتے کہ اگر لڑکا ہوگا تو میں کا نام اورنگ زیب رکھوں گا اور کبھی کہتے نہیں نہیں جہانگیر رکھوں گا۔ میں کہتی کہ اگر لڑکی ہوئی تو؟

اس پر وہ جواب دیتے کہ اس کا نام تم رکھنا غرض ہم نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ لڑکا ہوگا تو اس کا نام یہ تجویز کریں گے اور لڑکی ہوئی تو میں نام رکھوں گی۔

آخر لڑکی پیدا ہوئی اور میری مرضی کے مطابق اس کا نام قمر آرا رکھا گیا۔

قمر بہت خوبصورت تھی۔ جوں جوں وہ بڑھنے لگی اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگتے گئے۔ ہمارے اس پاس کی بڑی بوڑھیاں سب تاکیداً کہتیں کہ میں اس کے بازوؤں پر کالا دھاگہ باندھ دوں تاکہ کسی کی نظر نہ لگ جائے۔

مگر قمر کا وہ زیادہ خیال نہیں کرتے تھے۔ نہ کبھی اُسے پیار کیا۔ نہ کبھی اس کو گود میں اٹھایا۔ میں نے خیال کیا کہ بعضوں کو چھوٹے بچوں کو اٹھاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ شاید یہ بھی ڈرتے ہوں کہ قمر کا نازک بدن کہیں دب نہ جائے۔

جب قمر ۲ سال کی ہوئی۔ تو وہ کچھ کچھ بولنے بھی لگی۔ ایک مدت میں نے اس کو یہ بولنا سکھایا۔ "ابّا۔ ابّا۔ آؤ۔ آؤ" جب یہ آفس سے آئے تو میں نے قمر کو ان کے نزدیک لا کر کہا۔ دیکھئے آج قمر کتنا پیارا جملہ بولنا سیکھی ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ قمر ابّا کو بلاؤ۔ وہ کہنے لگی "ابّا۔ ابّا۔ آؤ۔ آؤ"۔ انھوں نے میری طرف لاپرواہی سے دیکھ کر کہا۔ کہ یہ کونسی نرالی بات ہے اور ایسا تو سب بچے کہتے ہیں اور یہ کہکر وہ باہر چل دئیے۔ قمر پھر کہنے لگی۔ ابّا ابّا۔ آؤ آؤ۔ مگر اس کے ابّا تو کہیں چل دئیے تھے۔

میں نے یہ سوچا کہ رفتہ رفتہ انھیں قمر کا خیال کرنا پڑے گا۔ بعضوں کو لڑکیوں کی بہ نسبت لڑکوں سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ شاید یہ لڑکا چاہتے تھے۔ مگر بدقسمتی سے لڑکی پیدا ہوگئی۔

قمر اب دو سال کی ہو چکی تھی اور تتلا تتلا کر بہت میٹھی میٹھی باتیں کرتی تھی۔ ایک روز جب کہ یہ آفس سے تھکے ہوئے آرہے تھے کہ قمر نے کہا ابّا مجھے گُڑیا (گڑیا) لا دو۔ آنکھ بند کرنے والی۔ لال پھلاک والی، فراک (اگر کوئی کیسا ہی رنجیدہ ہوتا اس وقت اس کی باتوں پر ضرور ہنس دیتا۔ مگر یہ تھے کہ منہ بگاڑ کر کہنے لگے جب دیکھو گڑیا کی رٹ لگا رکھی ہے۔ مرتی بھی نہیں۔ کہ سر سے بلا دور ہو۔

اگر اس وقت میں یہ کہہ دیتی کہ بھلا آپ نے اس کو کب گڑیا یا کوئی کھلونا لا کر دیا ہے تو شاید اس وقت معاملہ طول کھینچتا۔ میں نے چپکے سے قمر کا ہاتھ پکڑ کر اس کو دوسرے کمرے میں بند کر دیا تاکہ معاملہ ختم ہو جائے۔

اکثر میں تنہائی میں یہ سوچتی کہ انھیں قمر سے بھلا کیوں نفرت ہے۔ والدین کے لئے لڑکا، لڑکی برابر ہیں اور پھر ایک تعلیم یافتہ شخص کو تو بالکل امتیاز ہی نہیں کرنا چاہیئے۔

ایک دن انھوں نے مجھ سے کہا کہ آج بازار سے مچھلی منگانا اور اس کو تل لینا۔ میں نے جواباً کہا۔ بہت اچھا۔ جب مچھلی تل چکی تو قمر لگی رونے اور چیخنے اور ضد کر کے بیٹھی کہ وہ مچھلی ضرور کھائیگی میں نے اس کو ایک ٹکڑا دیدیا۔ جب وہ دوپہر کو یہ آفس سے کھانے کے لئے آئے تو دیکھا کہ مچھلی کا تھوڑا سا حصہ غائب ہے چلا کر کہنے لگے کہ اس گھر میں میرا رہنا دشوار ہے۔ جو چیز کھانے کو دل چاہتا ہے اس میں سے پونا حصہ غائب ہو جاتا ہے اور پھر مجھ سے کہنے لگے۔ کہ سب ہی کیوں نہ اپنی لاڈلی کو دیدیا۔ اور لو یہ بھی دیدو۔ میں نے کہا صاحب سب تو رکھا ہوا ہے تھوڑا سا میں نے اس کو دیدیا تھا آپ کیا پوری مچھلی کھا لیتے۔

"سب کھانا نہ کھانا میری مرضی پر منحصر ہے۔ تم نے اس کو کیوں دیا۔ اگر میں نے پھینک دیا ہوتا تو مجھے خوشی ہوتی۔"

"اگر میں پھینک دیتا تو مجھے خوشی ہوتی" میں نے غصہ سے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ ہر وقت اس پر خفا کیوں ہوتے ہیں۔ اس نے آپ کا کیا بگاڑا ہے۔ پہلے تو آپ ایسے نہ تھے۔ اپنے بھائی اشرف ہی کو دیکھئے غریب ہے پیٹ بھر کھانے کو بھی نہیں ملتا۔ مگر بچوں سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ ایک آپ ہیں کہ خدا نے آپ کو سب کچھ دے رکھا ہے۔ مگر اس بچی کے لئے کچھ بھی نہیں۔ میں نے یہ مان لیا کہ پہلے سے اب ہماری مالی حالت خراب ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُس کا بدلہ اس معصوم بچی سے لیں۔"

بدلہ، بدلہ، یہ کہتے ہوئے وہ نیچے چل دیئے!

قمر نے کہا۔ اماں ابّا کُلیا لینے گئے ہیں؟ میں نے جل کر کہا خاموش بیٹھ چڑیل۔ اگر آج تو نہ ہوتی۔ تو یہ فساد ہی کیوں ہوتا؟

رات ہوئی اور یہ نہ آئے صبح ہوئی اور پھر شام، مگر ان کا پتہ نہ تھا۔ شاید بدلہ لے رہے ہیں۔ میں نے سوچا۔ اسی طرح کئی ہفتے اور پھر مہینے ہوگئے۔ مگر وہ نہ آئے۔ کئی مرتبہ دل میں آیا کہ ان کے پاس جا کر معافی مانگوں اور ان کو گھر لے آؤں مگر غرور نے میرا سر نہ جھکایا۔

اب قمر کی صورت سے مجھے نفرت ہو گئی تھی نہ تو اس کے سر میں تیل ڈالتی اور نہ اس کا منہ ہی دھلاتی۔ غریب سب کچھ اپنے ہاتھوں سے کر لیتی تھی۔ بعض وقت تو میں اس کو پیٹتی اور پھر جب وہ بہت رونے لگتی تو اس کو سینہ سے چپٹا لیتی۔

چھ ماہ گذر گئے۔ لیکن وہ نہ آئے۔ قمر کو ٹائیفائڈ ہو گیا تھا تمام عزیز و اقارب اس کو دیکھنے کے لئے آئے۔ مگر وہ نہیں آئے۔ قمر کے بچنے کی بالکل امید نہ تھی۔ رات بھر میں اس کی خدمت کرتی ایک روز جب کہ بخار بہت تیز ہو گیا تھا اور قمر کو ہوش تک نہ تھا کہ اچانک میری آنکھ لگ گئی۔ خواب میں دیکھتی ہوں کہ قمر مر چکی ہے جب اس کی موت کی خبر لوگوں نے انھیں جا کر دی تو وہ بہت ہنسے اور کہنے لگے کہ اب میں گھر سے کبھی نہ جاؤں گا۔ قمر ایک بلا تھی۔ اس کی صورت سے مجھے نفرت تھی اب وہ مر چکی۔ میرا دل خوش ہوا۔ یہ سب باتیں سنکر میں نے ایک چیخ ماری اور میری آنکھیں کھل گئیں۔ قمر کے پاس جا کر دیکھا تو اس کا بخار بالکل اُتر چکا تھا۔ اور ہوش بھی آگیا تھا۔ میں نے اس منحوس خواب کو بھلا دیا اس کے بعد جائے نماز اٹھا کر شکرانہ کی نماز ادا کی اور دعا مانگنے لگی کہ اے خدا تو ان کے دل میں رحم ڈال دے اور وہ جلد گھر واپس آجائیں۔ جب میں نماز سے فارغ ہوئی تو دیکھا کہ قمر بستر پر سے غائب تھی اور میرے پیچھے کھڑی ہے۔

قمر بالکل تندرست ہوگئی۔ اب ہر وقت نیا فراک کے لئے ضد کرتی۔ کچھ دن بعد میں اس کو مارکٹ فراک دلانے کے لئے لے گئی۔ وہاں جا کر دیکھا کہ قمر کے ابّا ایک کھلونے کی دوکان کے پاس کھڑے ہیں اور حسرت بھری نظروں سے کھلونوں کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ میں اُس کھلونے کی سامنے والی دوکان میں گھس گئی تاکہ آسانی سے انھیں دیکھ سکوں۔

دوکاندار نے ایک نہایت ہی خوبصورت فراک لا کر دکھایا۔ اور کہنے لگا۔ بائی جی یہ فراک لے لو۔ یہ تو پیرس کی ڈیزائن ہے مگر میں نے اس کی باتوں پر کوئی توجہ نہ کی۔ اس نے خیال کیا کہ شاید فراک پسند نہیں ہے اور دوسرا فراک لے آیا۔

قمر نے کہا اماں۔ ابّا کھڑے ہیں وہ دیکھو۔ میں نے اس کو چپ رہنے کیلئے کہا۔ مگر وہ بھلا کب ماننے والی کیونکہ اس کے ابّا کھلونوں کی دوکان پر کھڑے تھے۔ وہ مجھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر ان کے پاس بھاگ گئی اور زور زور سے کہنے لگی۔ ابّا وہی لال فراک والی گڑیا چاہیئے۔ اس کے ابّا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور فرط محبت سے اس کو گود میں اٹھا لیا۔ پھر وہ کہنے لگی۔ ابّا وہ ٹیلم ٹیلم (ٹرام) چاہیئے اس میں میں بیٹھ کر اسکول کو جاؤں گی۔ ابّا اماں روز روز دعا کرتی تھیں کہ آپ گھر آجائیں اور میرے لئے ایسی گڑیا بھی لے آئیں اور ہاں ابّا وہ مجھے مارتی تھیں (ہاتھ سے بتا کر) ابّا اماں کی بڑی (خراب ہیں اور ابّا وہ الماری دیکھئے۔ اس میں لال فراک گڑیا کا کپڑا رکھی گئی۔

انھوں نے اس کو سب کچھ دلا دیا اور ہنستے ہوئے میری طرف آنے لگے میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے میری دعا سن لی۔

مرگھر ہو پہنچے ہی قمر نے انھیں اپنا کتا۔ بلی اور سب کھلونے دکھائے اور کہنے لگی۔ ابّا سی۔ اے۔ ٹی کاٹ یعنی بلی۔ آر۔ اے۔ ٹی راٹ یعنی چوہا۔ اور ان دو لفظوں کو بار بار دہرانے لگی۔ میں نے اس کو کہا۔ چل ہٹ دماغ کیوں خراب کر رہی ہے۔ اس پر وہ فرمانے لگے ارے کیوں خفا ہوتی ہو۔ نرمی سے کہو۔ بچہ ہی تو ہے۔ مگر اس وقت میں یہ کہہ دیتی کہ صاحب اپنے پچھلے کرتوتوں کو یاد کیجئے ان کو کتنا رنج ہوتا۔ (ختم)

خوابوں کی دنیا

از فضل حق صاحب قریشی دھلوی

دونوں وقت ملتے اس نے یہ قصہ سنایا تھا:

شفق کی تو بزی سرخیاں اُفق مغرب میں سیاہی مائل پڑتی جا رہی تھیں اور ماہ تمام فلک پر جبیب ساقی کے لئے جلوہ گر ہو چکا تھا ہم دونوں باغ کے ایک کنج عزلت میں بیٹھے پہاڑیوں کے عقب میں روشنی کو مدغم ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مینائے شفق کی جادو اثری تھی۔ کہ وہ فلک سا پہاڑ کسی ایسے غیر ملک کے سایوں سے مشابہ معلوم ہو رہے تھے۔ جو ہماری محدود اور دور رس انسانی نظروں سے پوشیدہ تھا۔ یہی وہ کیفیات تھیں۔ جن کے ماتحت وہ مجبور ہو گیا۔ کہ اپنے دل کے راز ہائے پنہاں کو میرے سامنے منکشف کر سکے۔ یا ممکن ہے وہ کوئی اور جذبہ ہو جس کو سمجھنے سے میں قاصر ہوں۔

جب اس نے یہ قصہ ختم کیا۔ تو شفق بالکل مفقود ہو چکی تھی۔ ہلال مغربی پہاڑیوں کے پیچھے چھپ گیا تھا اور نیلے فلک پر ستاروں کے زرّیں ذرّے چمکنے جا رہے تھے۔

ایک طویل خاموشی کے بعد میں نے راز دارانہ طریقہ پر اس سے پوچھا۔ "کیا میں دوسرے لوگوں کے سامنے اس کو بیان کر سکتا ہوں تاکہ وہ بھی اثر لے سکیں"

"اور اس نے جواب دیا" ہاں! دوسرے لوگوں کو سنا دینا تاکہ وہ بھی جان لیں...... وہ بھی سمجھ لیں۔

مجھے اس سے بہت گہری محبت تھی۔ مجھے کوئی ایسا لمحہ یاد نہیں آتا جو اس کی محبت سے خالی گذرا ہو مجھکو اچھی طرح یاد ہے کہ جب پہلی بار ہم دونوں ملے تو ہم نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہایت عمیق دیکھا اور بس...... وہ میری تھی اور میں اس کا مجھے اس کا احساس تھا۔ میں نے اکثر تعجب سے اس امر پر غور کیا کہ کیا اس کو بھی محبت تھی۔ تاہم میں اسی خیال کو دل میں جاگزین رکھنا چاہتا ہوں کہ اس کو بھی محبت تھی۔ کیونکہ خواہ کچھ ہی ہو۔ میں نے اس کے چہرہ پر کبھی ایسی نعومت و رعنائی نہیں دیکھی جیسی کہ اس وقت نظر آئی تھی۔ اور اس کی آنکھیں......... پناہ بخدا .... میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی کہ کبھی دوسری ہستی کے لئے ایسی ناممکن البیان گہرائیاں ان میں پیدا ہوئی ہوں گی۔ خیر پھر بھی زندگی میں ایسے لمحات گذرے ہیں جب میں نے محسوس کیا کہ وہ خود بھی نہیں جانتی کہ کس درجہ بیتابی کے ساتھ اس کی روح شوق دید میں آنکھوں کی پُر سکوت پرستش گاہوں میں سے ہو کر میری جانب تردلِ رحمت فرماتی رہتی ہے۔

میں جانتا ہوں جو امر دریافت کرنے کے لئے تم بہت بےچین ہو۔ یہی نا کہ میں نے اس کے سامنے اظہار محبت کیوں نہیں کیا؟ آہ! عزیز دوست! میں اس سے نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ ہمارے درمیان کچھ رکاوٹیں قائم تھیں۔ ایسی رکاوٹیں جن کو اس زندگی میں دور کرنا محال تھا میں بزدل تھا کہ کبھی اس کے سامنے یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ

"مجھے تجھ سے محبت ہے"

میں جانتا ہوں کہ تم ان رکاوٹوں کی نوعیت کے متعلق کوئی استفسار نہیں کرو گے کیونکہ انہیں بیان کرنے کی مجھ میں طاقت نہیں ہے سرف اتنا سن لو کہ وہ شادی شدہ تھی اور میں اس کے برعکس تجرد کی زندگی بسر کر رہا تھا

ابتدا میں ایک شدید کشمکش تھی۔ روح کی ایک زبردست جد و جہد جو اپنی دوسری جنس کے لئے تڑپ رہی ہو۔ وہ ہیجان جذبات اور وعدہ کر سب کے قوی ارتعاش سے اس اعتقاد حقیقت کو دل سے نکال دینے کی کوشش میں تھی کہ "ایسا نہیں ہوگا کبھی نہیں ہوگا"

پھر...... اس کے بعد زندگانی کا وہ خوفناک طوفان ایک بہتے ہوئے پانی کی طرح رخصت ہو گیا جوانی کی وہ تمام اُمنگیں بےحسی کے سوگوار دامن میں آسودہ خواب ہو گئیں شباب کی سرمستیاں اور بادۂ حسن کی نشاط انگیز کیفیات کو اپنی روحانی خلوتوں میں دعوت پذیرائی نہ دے سکیں۔ بالکل اس طرح جیسے تیز و تند آندھی کے بعد خاک کا ایک ایک ذرّہ سے لے کر ڈالی پر کھلے ہوئے پھول تک کائنات کی ہر شے سکون و طمانیت کی طالب نظر آنے لگتی ہے۔ اور ایسا ہو جانا لازمی تھا۔ کچھ تو افتضائے عمر اور کچھ اس لئے کہ میں نے خود اپنی آرزوؤں کو پامال ہو جانے کا موقع دیدیا تھا تاکہ میرے لئے سرچھپا لینا ممکن ہو جائے۔ بہار زیست کی خزاں رسیدگی کے ساتھ تاہم باوصف اس فضائے افسردگی کے میں اس طرح وارفتہ تخیل رہا۔ اپنی تصوّرات کی دنیا میں اپنی لوح قلب پر کسی کا نقش خیالی لئے ہوئے۔

میں نے کبھی اس کی کوئی خدمت نہیں کی حتیٰ کہ دوران علالت میں بھی نہیں۔ حالانکہ میری زبردست آرزو تھی کہ کسی طرح اس کے درد میں شریک ہو کر اس کے الم حیات کو ــــ خواہ وہ کسی نوعیت کا ہو ــــ اپنے وجود میں جذب کر کے اپنی روح کو مبتلائے غم کر لوں۔ تاکہ اس کی زندگی فضائے مسرّت و شادمانی میں بسر ہو سکے۔ اور اسی لئے ہمیشہ میرا دل بےچین ہو کر تڑپ اٹھا جب کبھی میں نے اس کے چہرے پر حزن و اضمحلال کے آثار دیکھے۔ مگر مجبور تھا۔ بڑے ضبط و تحمل سے کام لیکر انتہائی اجتناب کے ساتھ اپنی ہستی کو اس سے الگ رکھنا چاہتا تھا۔ اس طرح گویا مجھے ڈر ہے کہ اس کا تنفس ــــ جو حقیقتاً تریاق اثر اور روح افزا تھا کہیں میرے جسم کو مسموم نہ کر دے۔

چند بار میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اس کے لبوں کو ایک آرزوئے سپردگی کے ساتھ چوم لوں۔ ایک جذبہ احترام کے ماتحت ہی سہی تاکہ اس لذت التشام کی ابدیت میں ہماری زندگی موسم بہار کی سہانی راتوں میں دیکھے ہوئے ایک لطیف خواب کی مانند ہمیشہ بہتی رہے اور ہمیں یہ محسوس بھی نہ ہو کہ دنیا کا رخ کس طرف ہے۔ لیکن اس کا ذکر ہی کیا میرے اندر اتنی جرأت ہی نہیں تھی۔ کہ مندر کے پجاری کی طرح جو ایک جوش عقیدت میں دیوی کے سامنے سربسجود ہوتا ہے کبھی اس کے قدموں پر سر رکھ دوں۔ مجھے حد درجہ اندیشہ تھا۔ مبادا اس کے اعضاء کا لمس میرے جسم میں ایک غیر ارادی ارتعاش پیدا کرے اور اس طرح دل کا راز لوگوں پر منکشف ہو جائے۔

"محبت کی معراج یہی ہے کہ وہ کبھی ظاہر نہ ہو"

اس اجتناب کے باوجود میری روح کی مقناطیسی قوتیں دور ہی دور سے اس کو عافیت کی فضا میں گھیرے رکھتی تھیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ میری نظروں سے اوجھل ہو اور میرے خیالات کی رو میں میرے دل کی سچی دعائیں اس کے ہمراہ نہ رہی ہوں میری سب سے بڑی آرزو یہ تھی۔ کہ "وہ خوش رہے" شاید اس کو بھی میری ان غائبانہ ہمدردیوں کا احساس تھا۔ کیونکہ بارہا اس کے لبوں کو اظہار تشکر کے لئے جنبش ہوئی۔ گو میرے سامنے نہیں۔ میری غیر موجودگی میں۔ مگر مجھے اس کا علم ہو گیا ــــ کس طرح ــــ؟ اس کو میں خود بھی نہیں جانتا ــــ میرے دوست! دل کی دنیا عجیب ہوتی ہے۔

اس کے بعد سے یہی دستور رہا کہ میری قوت خیال ہمیشہ اس کی معاون و مددگار رہی۔ ایک دن ــــ برسوں کی محبت کے بعد کا ذکر ہے ــــ ایک حیرت انگیز واقعہ پیش آیا۔ میں بڑی شدّ و مد سے کہتا ہوں کہ ایسا ہو نہیں سکتا۔ ہرگز نہیں ہو سکتا۔

مگر ایسا ہوا ضرور تھا۔ میں نے اس کو انتہائی خطرہ کی حالت میں دیکھا۔ ایک ایسی پریشانی میں کہ میرے دل کی حرکت رُک سی گئی۔ میں نے اور ہزاروں آدمیوں نے اس منظر کو بچشم خود دیکھا۔ کسی میں اتنی مجال نہیں تھی کہ آئندہ ہونیوالے واقعات کو الٹ دیتا زندگی اور موت کا سوال تھا۔ فرشتۂ اجل قریب پہونچ چکا تھا۔ میں ایک دیوانہ کی طرح یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ مگر کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ اچانک وہ واقعات اس طرح بدل گئے جیسے خواب کی حالت سے ایکدم بیدار ہو جانے کے بعد ہر گذری ہوئی بات انہونی معلوم ہونے لگتی ہے۔ وہ بالکل بخیر و عافیت میرے پہلو میں کھڑی ہوئی مسکرا رہی تھی۔

دیکھنے والے متعجب تھے۔ کہ یہ کیسا معجزہ ہو گیا۔ لیکن میں نے وہ سب کچھ دیکھا جس کو دیکھنے سے عام لوگ قاصر تھے۔ میری آنکھوں نے وہ کرشمۂ غیبی دکھایا۔ جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ آسمان سے ایک فرشتہ اُترا ہے ــــ نہایت سرعت کیساتھ ــــ سفید لباس میں ــــ

وہ آیا اور اس نے میری محبوبہ کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا وہ بالکل محفوظ تھی۔ موت کا سایہ آگے بڑھ چکا تھا۔ میں فرشتے کے قریب گیا کہ کم از کم سماوی مخلوق کے اس نمائندہ کا شکریہ ہی ادا کر دوں۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی اور جب میں نے ذرا غور سے دیکھا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اس کا چہرہ خود میرا چہرہ تھا۔ بالکل مجھ سے مشابہ سر مو فرق نہیں تھا۔ میں نے انتہائی تعجب کے ساتھ پلٹ کر پیچھے کو دیکھا۔ تو میں اس جگہ موجود نہیں تھا یعنی میں وہاں سے غائب ہو چکا تھا اور پھر بھی اس کے قریب کھڑا تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی گویا اپنے تبسم کے الفاظ میں اظہار شکریہ کر رہی تھی اور میں صرف کپکپا رہا تھا۔

لوگ کہتے ہیں کہ اس کو بچانے والا تو میں تھا لیکن میں اس کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ کبھی نہیں تاہم مجھے یقین ہو گیا کہ میری ہستی کا ایک جزو میرے وجود سے الگ ہو کر ایک جیتی جاگتی ہستی ہو گیا ہے جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتا ہے اور اس طرح میری لاعلمی میں میری شخصیت کا ایک پرتو اس کی خدمتگزاری میں صرف ہو رہا ہے۔ یہ میری محبت کی تجلیاں ہی وہ کام انجام دے رہی تھیں جو خود میرے امکان میں نہیں تھا میں نے آرزو کی کہ کاش میرا ایک ایک ذرہ اس کے کام آ جائے اور اس کے عوض مجھے پھول ملے حتیٰ کہ اس حقیقت کا اس کو علم بھی نہ ہو۔ محبت کا یہ اجر ادا ہو کہ محبت کا جواب محبت سے دیا جائے۔ میری نگاہ میں کوئی وقعت نہیں رکھتا۔

زمانہ بدلتا گیا اور میرا دل جل کر بھی خاک نہ ہونے کے انداز میں بدستور جلتا رہا۔ بارہا ہم ایک دوسرے سے ملے تنہا اور نابھی ہو گئی اور ہمیشہ میں نے دیکھا اور یہ صرف میرا خیال ہے کہ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں ایک عجیب یاس انگیز چمک تھی۔ ہمیشہ میں نے سنا یا شاید میرا خیال ہے کہ میں نے سنا۔ اس کی آواز میں ناکامیوں کے احساس کا ایک درد شامل ہوتا تھا جس کا تجزیہ قطعی دشوار ہے میرے دوست! ممکن ہے تم اس کو تسلیم نہ کرو۔ نہ سہی۔ دنیا کی سیکڑوں حقیقتیں ہیں جن کو عام لوگ نہیں مان سکتے اگر میں کہوں کہ رات کی تاریکی پر ستاروں کی چمک حاوی ہو جاتی ہے اور ان کے روشن ہوتے ہی کائنات کی ہر خوابیدہ و بیدار شے ایک دوسرے نور میں غرق ہو جاتی ہے تو سب کہیں گے کہ صحیح ہے۔ لیکن اگر میں یہ کہوں کہ رات کے پرسکون لمحات میں درخشاں تاروں کی محفل میں مدہم سُروں کا باجہ بجتا ہے اور ایک حالت رقص میں سرزمین ماہتاب سے نکل کر میری محبوبہ اپنی نازک انگلیوں کی لمس سے کہکشاں کے زرتار دامن پر اس طرح ترنم ریز ہوتی ہے کہ نغمے کے ہر شیریں آہنگ میں اس شراب کا سا نشہ بھی ہوتا ہے جس کی کیفیت طلوع آفتاب کی روشنی کے باوجود زائل نہیں ہوتی۔ تو شاید تم بھی میرے اس حقیقی جذبہ محبت کو ہذیانی تصورات سے تعبیر کرو گے۔

خیر ان باتوں کو چھوڑو۔ اندیشہ ہے کہ میری داستان سرگذشت تکمیل سے محروم نہ رہ جائے۔

ایک کبھی نہ بھولنے والی رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میں تن تنہا آسمان کی بلندیوں سے ایک ڈھلوان پہاڑوں کے دامن میں اتر رہا ہوں ایسا معلوم ہوا کہ مجھے بہت جلدی ہے لیکن اپنی اس عجلت کا سبب خود مجھے بھی معلوم نہیں تھا میری منزل مقصود کیا تھی؟ بس خدا ہی کو اس کا علم تھا۔ دفعتاً میں ایک عمیق وادی میں پہونچ گیا جو دونوں پہاڑوں کے سایہ میں گھری ہوئی تھی۔ مجھے گمان ہوا کہ غالباً اس وقت میں اس وادی تاریک میں ہوں جس کو موت کا بھیانک آغوش بھی کہتے ہیں۔ میں سراسیمگی کے عالم میں کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ وادی کی ایک سمت سے کوئی کپکپاتے قدموں کے ساتھ داخل ہوا۔ جیسے جنگل کا کوئی ہرن شکاری کی گولی سے سہم کر آہستہ آہستہ چل رہا ہو۔ میری پیشانی پر سرد پسینہ نمودار ہو گیا اور برف کی مانند کسی ٹھنڈی چیز نے میرا دل اپنی گرفت میں لے لیا کیونکہ نووارد خود میری محبوبہ تھی۔

میں نے چاہا کہ لپک کر اس کو اپنی آغوش میں لے لوں مگر دیکھا کہ وہ میں جو ابتدا سے ہمارے درمیان حائل تھیں۔ آخر آنے لگیں اور میں اپنے ارادے سے باز رہا۔ میں نے بولنے کی کوشش کی لیکن سکوت۔۔۔ تمام فضا میں حد درجہ خوفناک، ناقابل شکست اور ابدی سکوت طاری تھا جس نے میرے لبوں کو کسی غیر مرئی زنجیر سے جکڑ دیا تھا اس نے دو قدم اٹھائے بالکل تنہا وادی کے عمیق ترین سایوں میں چلتی چلی گئی۔

اس کی آنکھیں جھکی تھیں لیکن یکایک اس نے اپنا سر اٹھایا۔ اس کا نورانی چہرہ میرے سامنے تھا وہ سراپا ایک ایسے دلپذیر تبسم میں ڈوبی ہوئی تھی جس کی شگفتگی اور لطافت صرف ناقابل بیان ہی نہیں بلکہ غیر ممکن الفہم بھی ہوتی ہے۔ حیرت کا مقام ہے کہ ایسے خطرناک ماحول میں وہ بالکل مطمئن، بلکہ ایک حد تک دلیر معلوم ہو رہی تھی۔

چوتھی قسط

بنتِ لیلےٰ کے خطوط

از پریمی

ابن القیس!

چشم بد دور، آجکل حضور کی طبیعت کی جولانیاں زوروں پر ہیں ــــ کیوں نہ ہو آزاد ہیں، خود مختار ہیں، "تعلیم زدہ" اور دولتمند ہیں۔ اور ان سب پر طرفہ یہ کہ تہذیب و تمدن کے ٹھیکیدار بھی آپ ہی ہیں۔ مشینیں اور آلات نصب کر رکھے ہیں۔ طبیعت عیش پرستی سے اُکتائی، قوانین اور احکامات ڈھالنے شروع کر دئیے۔ غلط فلسفہ و منطق کے قمقموں سے جو ٹروت ڈھالا جائے اور تہذیب و اخلاق کی جس پر مصنوعی جلا کر دی جائے وہ آخر بازار تمدن میں کیوں نہ ہاتھوں ہاتھ خرید کیا جانے لگا؟

بہا اوقات راتوں کو سوچ سوچ کر کس قدر ہنستی ہوں کہ جب میں تمہارے ہمراہ ہوتی ہوں اور تم مجھے اپنے جاہلانہ سوالات سے تنگ کرتے ہو۔ کبھی کہتے ہو۔ "میری جان وہ کون رقیبِ روسیاہ تھا جس نے کل میری ایک پوری رات ضائع کر دی" کبھی کہتے ہو "کیا کبھی تمہیں میرا خیال نہ ہوگا۔ کبھی میری محبت کو اپنے دل میں جگہ نہ دے سکو گی۔ بظاہر تم ایک نرم و نازک پھول ہو لیکن، بحقیقت ایک پتھر ہو سا کن و جامد بنتِ لیلیٰ ــــ

کیا تمہیں یقین نہیں آتا کہ جن راتوں میں تم مجھ سے دور رہتی ہو ــ میرا دل ایک ناقابلِ ضبط بوجھ سے دبتا چلا جاتا ہے۔ ساری کی ساری رات جاگ کر یوں آنکھوں میں کاٹ دیتا ہوں۔ تاروں کو دیکھتا ہوں اور تمہاری مدھ بھری آنکھیں یاد آ جاتی ہیں۔ چاند پر نظر پڑتی ہے اور تمہارا روشن چہرہ میری نگاہوں میں جگمگانے لگتا ہے۔ رات گذرتی جاتی ہے اور میں تمہارے خیالات میں اُلجھا ہوا تڑپ تڑپ کر صبح کر دیتا ہوں۔ ــــ کیا ایسا نہیں ہو سکتا ہے، میری جان! اگر تم غیروں کی آمد و رفت بند کر دو۔ مجھ سے تو یہ نہیں دیکھا جاتا کہ جس ہستی کا میں والہ و شیدا ہوں۔ اس کو کوئی دوسرا بھی چاہے۔ میں اس کو کیسے برداشت کر لوں کہ ہم دونوں کے درمیان کوئی تیسرا بھی حائل ہو۔

بولو! کیا تم اس کو پسند کرتی ہو کہ تمہارے اوقات کا تنہا میں مالک بن جاؤں ــــ تم اپنے باغ کا تنہا شاداب پھول ہو اور تمہیں نغمۂ محبت سنانے کے لئے ایک ہی بلبل ہونا چاہئے کیا تمہیں میری محبت و اُلفت کا یقین نہیں آتا۔ کیا میں تمہاری پرستش کرنے کے ناقابل ہوں ــ؟ بولو ــ جواب دو ــ؟

اور جب تمہاری ہرزہ سرائی سے اُکتا کر میں تم سے کہتی ہوں کہ "اس باغ میں تنگ داماں نہ ہو ــ بہت سے پھول کھلے ہیں جتنے چاہو توڑ لو۔ دامن میں خوب بھر لو۔ جب تک چاہو۔ اس کی لطافت اور خوشبو سے اپنے آپ کو مسرور کر دو اور جب سیر ہو چکو تو پنکھڑیوں کو توڑ کر ہوا میں منتشر کر دو پیروں سے روند ڈالو اور خاک کے ذرات میں مدغم کر دو۔ تو تم میرا منہ تکنے لگتے ہو اور سوچنے لگتے ہو کہ یہ کیا کہہ رہی ہے"

پھر جب میں تمہیں سمجھاتی ہوں اور کہتی ہوں کہ میں تو "مشترکہ سرمایہ" ہوں۔ ہر شخص کی املاک ہوں جس طرح تم میرے باغ نما سینے کی کلیوں پر اور بھی اَحمق ہیں جس طرح تم اپنی تنہا راتوں میں جلتے بھنتے رہتے ہو۔ دوسروں کے لئے بھی ایسے مواقع پیش آتے رہتے ہیں مجھے ہر ایک کی دلجوئی کرنی پڑتی ہے ہر ایک کا خیال کرنا پڑتا ہے پھر میں کیونکر صرف تمہارے ہی نفس کی اطاعت کر سکتی ہوں۔

اور جب میں تمہیں مشورہ دیتی ہوں کہ غصہ آدمی کو برسات میں دو چھتریاں رکھنی چاہئیں تاکہ اگر ایک کھو جائے تو دوسری کام آئے تو میرے سامنے تو اپنی گز بھر لمبی ناک کو "روتے بسورتے" منہ چھپانے ہوا اور بیٹھ اپنے گھر پہنچتے ہو۔ تو کیا کیا نہ ہرزہ سرائیاں نہیں کرتے کبھی کہتے ہو "اس تلقینِ عیش پرستی کا کیا مطلب؟ برسات اور دو چھتریاں! ایک عقلمند آدمی کے لئے"۔ کبھی کہتے ہو "میں اور اس کی مٹ خبیثہ کا طالب! تم محبوب اور اپنے عاشق سے ہرجائی بننے کی آرزو، وہ بھی فلسفیانہ رنگ میں اس کو عیاشی کی تعلیم! اور مدلل ترغیب کیا ہوئی تمہاری غیرتِ نسوانی!"

مجھ سے متمنی ہو کہ خلوت کے لئے دل و دماغ علیحدہ رکھوں۔ تمہارے راستے پر دو سری کا ستے دل بہلاؤں ..... خون اور جدائی کا خواب، "رغوان جائبی مغفور"! کیا غضب کرتی ہو۔ مجھ سے کیا کرانا چاہتی ہو؟ مرد کو عورت کے لئے تخریبِ اخلاق کا بانی اور قابلِ تکذیب سمجھتی ہو اور پھر عورت ہوتے ہوئے مرد کو بداخلاقی کا پیام جانتا ل دیتی ہو اور وہ بھی بھلا چاہنے کے پردہ میں یہ تمہارا خونچکاں ماحول ہے اور کثیف نفس جس سے تم متاثر ہو اور وہ بھی دانستہ و بالارادہ!

دیکھا ــ؟ اس کو کہتے ہیں ایک معقول اداکاری ــ اسمیں شک نہیں کہ اگر ہم لوگ (میں اور تم) کبھی کسی اسٹیج پر لیلیٰ مجنوں کے ڈرامہ کا مظاہرہ کریں۔ تو ایک بار تو تم اپنے زورِ خطابت میں حاضرین کو متعجب کر ہی دو۔ خواہ تمہارے تخیل کی پستی اور الفاظ کی بوالعجبیت کچھ دیر بعد حاضرین کو مسکرانے پر ہی کیوں نہ مجبور کر دے۔

میرے دوست! عیش پرستی کی میں تمہیں تلقین کرتی ہوں کہ تمہارا نفس کرتا ہے؟ وہ کیا چیز ہے کہ جو تمہیں کشاں کشاں میرے در تک گھسیٹ لاتی ہے؟ وہ کون جذبہ ہے کہ جس کے تحت تم میرے دوسرے گاہکوں کو تو بُرا کہتے ہو لیکن خود کو "دودھ کا دُھلا ہوا" ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہو؟ مجھ سے تو تم کہتے ہو کہ میں تمہیں عیاشی کی تعلیم دیتی ہوں۔ تو کیا تم راتوں کی تاریکیوں میں لوگوں سے چھپتے اور منہ چُراتے مجھ سے "درسِ عیاشی" لینے کے لئے آتے ہو؟

مجھ سے تو تم کہتے ہو کہ فلسفۂ عشق بازاری یا عیش پرستی کے اسباب پر کیوں نہ غور کیا۔ اور پھر ماشاء اللہ کیا خوب سمجھانے کی کوشش بھی کرتے ہو کہ "بنتِ لیلیٰ! سب سے بڑا محرک اتباع

نفس لئیم ہے جس کو ماحول اور گرد و پیش کے واقعات کی تخریب زدہ دار بنا کر ضمیر پر غالب کر دیتا ہے" لیکن جب اندھیری راتوں میں بھی برقعہ پہن کر اپنے دولتکدہ پر مجھے آنے کی دعوت دیتے ہو۔ تو تمہارے ضمیر کو کیا ہو جاتا ہے؟ تمہاری قوت امتیازی کدھر چلی جاتی ہے؟

نفس لئیم تمہارے پاس ہے ــ مردوں کے پاس ہے کہ جو دوسروں کا منہ تاک کر دیکھ کر رشک کیا کرتے ہیں کہ وہ خود کیوں "روسیاہ" نہیں ہیں۔ ایک عورت ــــ بازاری عورت کے پاس اس کا کچھ نہیں ہے۔ وہ مر مر کر زندہ رہتی ہے۔ وہ گھل گھل کر جیتی ہے۔ اس کے پاس نہ تو نفس ہے نہ ضمیر۔ وہ ہنستی ہے۔ تو دوسرے کی خاطر، وہ روتی ہے تو غیر کے لئے ــــ" اس کی آرائش و زیبائش، اس کا حسن و شباب، اس کی عصمت و عفت۔ اس کا مکان اس کا بستر ــــ سب تم لوگوں نے لوٹ لیا، اے حسن کے شریف ڈاکو!

تم نفس کی کثافت سے پہلے اپنے آپ کو پاک کر لو۔ پھر مجھے طعنہ دینا ــــ یہ تمہارے ہی نفس کی کثافت تھی کہ جس نے عورت کو بازار میں لا کر بٹھا دیا۔ یہ تمہارے ہی خیالات کی گندگی تھی۔ کہ جس نے گلاب کے درخت کو غلاظت پر اُگا دیا۔ پھر تم مجھے کس منہ سے طعن کرتے ہو۔

مجھے افسوس ہے کہ میں تمہاری تحریر کا نامکمل جواب دے رہی ہوں۔ بات یہ ہے کہ تمہارا درسِ اخلاق ہی کچھ ایسے بھونڈے قسم کا ہوتا ہے کہ میں گھڑیوں یہی سوچا کرتی ہوں کہ تم آخر وہ کچھ کیوں نظر نہیں آتے۔ جو تم اپنی تحریریں دکھائی دیتے ہو ــــ اب تو تمہارے "یکے از رقیبانِ روسیاہ" نازل ہو گئے ہیں۔ پوچھتے ہیں۔ خط کس کو لکھ رہی ہو؟ کسی اپنی سہیلی کو ــــ یا کسی خدائی خوار کو؟ اور میں انھیں یہ کہہ کر مطمئن کر دیتی ہوں کہ جی نہیں ــــ ایک تہذیب و تمدن کے ٹھیکیدار کو بہر حال آج اتنے ہی پر بس کرتی ہوں۔ آئندہ پھر کبھی ــــ!

(بنتِ لیلیٰ)

فی کاپی ۲؍

خزانچی
تعریف دو لفظوں میں پنہاں ہے
پینتالیسواں ۴۵ اور ہفتہ
کرشنا ٹاکیز
روزانہ ۴ بجے ۷ بجے اور ۱۰ بجے شب کو
سنیچر اتوار اور تعطیل کے دن
ایک بجے بھی شو زائد

ساتواں ہفتہ
پرکاش پکچرز اصلاحی فلم!
درشن
اداکارہ: پریم ادیب، جیوتی، بدھواڈوانی
اور شاکر وغیرہ
اوقات روزانہ ۴، ۷ اور ۱۰ بجے
سنیچر اتوار اور تعطیل کے دن ۱ بجے کو
لیمنگٹن ٹاکیز
(لیمنگٹن روڈ)

اس کی دنیا اُجڑ گئی، اس کا گھر برباد ہوگیا، وہ گاؤں والوں سے اپنے ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ مدد مانگنے آیا، مگر انھوں نے ٹھکرا دیا
پھر کیا ہوا؟ بہت جلد آپ کو معلوم ہوجائیگا
سُدرشن پکچرز کا حسین شاہکار!
سجن
ڈائرکٹر
دوارکا کھوسلہ
مکالمے اور گانے
پنڈت قانی
اداکاران:- جگدیش سیٹھی، حسن بانو، ستیش، ڈیوڈ، ارمیلا اور فلمی دنیا کے نامور مسخرے آغا و گوپ
بہت جلد آرہا ہے! لیمنگٹن ٹاکیز میں
اس ہفتہ — سرکس کی ایک آرٹسٹ کی رومانوی داستان — آجسے
انسان کی رقابت، خونخوار درندوں سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ محبت، موسیقی، رومان، کھیل، تماشہ، ہنسی مذاق اور رقص و سرود کے اعلیٰ کام
پیراماؤنٹ موویٹون کی پہلی موسیقی سے لبریز سرکس پیشکش
سرکس گرل
یعنی
سرکس کی سندری
ڈائرکٹر
بلونت بھٹ
ملکۂ سرکس
مس موتی کے
حیرتناک کرتب، ساتھ ہی
جال مرچنٹ، یوز، پوری، کلا،
دلدولیا، ریکھا اور آغا وغیرہ کے پُراثر کام
روزانہ ۳، ۶، ۹ بجے
جمعہ، سنیچر اور اتوار کو
۲ بجے زائد شو
سُپر ٹاکیز بمبئی
اتوار صبح دس بجے
ایک اسپیشل شو!
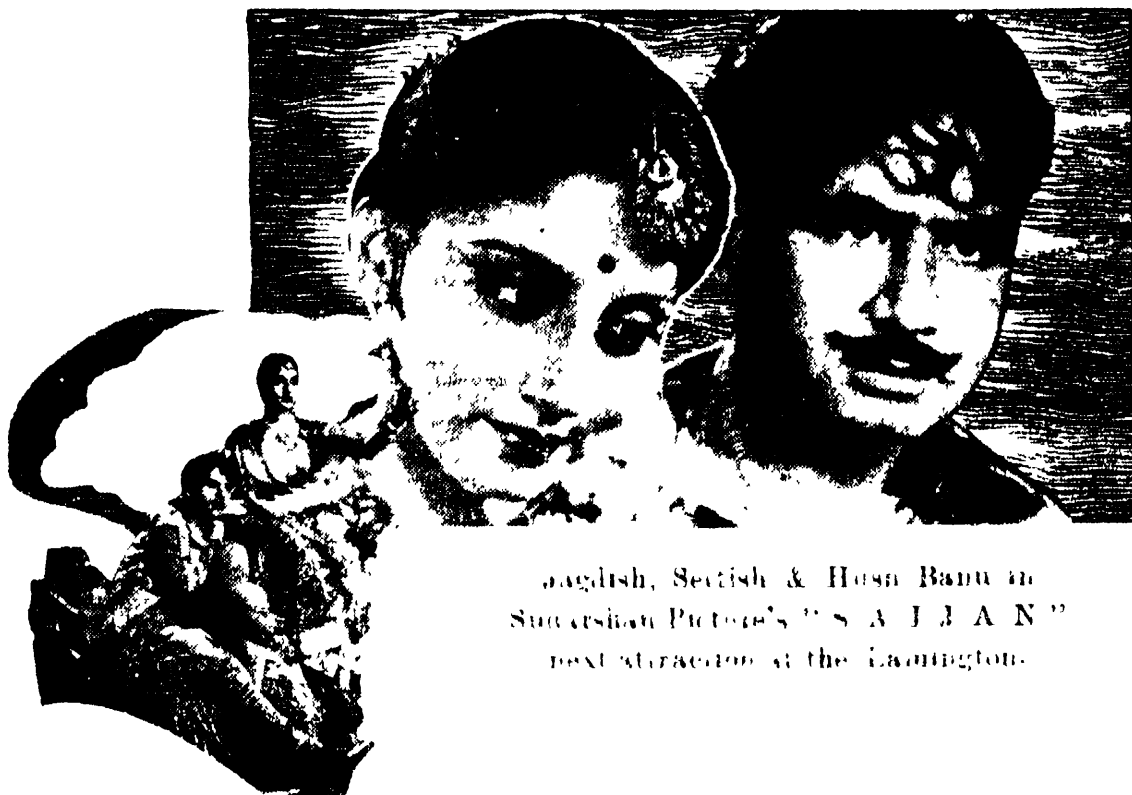
Jagdish, Setish & Husn Banu in
Sudarshan Picture's " S A J J A N "
next attraction at the Lamington.

MISS SHANTA His Master's Voice fame

Registered No. B 4546

DLEEB WEEKLY BOMBAY.

SUNDAY. 30 TH NOVEMBER. 1941. — No. 37

SARDAR AKHTER IN NATIONAL'S **NAI ROSHNI**

rinted at Ajmal Press Bombay. 3 and Published from The Nizam English School Bombay 11 by Nizamuddin Gulam Rasool.